اردو کا کلاسیکی ادب

حیاتِ سعدی

مصنفہ:-
شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

مرتبہ
شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مجلسِ ترقی ادب ۔ لاہور

طبع : دوم اپریل ۱۹۷۰ء

تعداد : ۲۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارہ امتیاز
ناظم ، مجلس ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : ریاض احمد چوہدری

مطبع : مطبع قوسین (شرکت محدود) تھارنٹن روڈ ، لاہور

سرورق وغیرہ : مطبع عالیہ ۱۲۰/۵ ٹمپل روڈ ، لاہور

قیمت : چار روپے پچاس پیسے

بعونِ صنّاعِ مکین و مکان و بفضلِ خلّاقِ زمین و زمان

۴

اردو کا کلاسیکی ادب

حیاتِ سعدی

مصنفہ

شمس العلما مولوی الطاف حسین حالی پانی پتی

ناشر

مجلسِ ترقیِ ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

پیش لفظ

(از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

حیاتِ سعدی کا پہلا ایڈیشن ۲۰ × ۸/۲۶ کی تقطیع پر ۱۸۸۶ عیسوی مطابق ۱۳۰۳ ہجری شائع ہوا تھا۔ کتاب مطبع انصاری دہلی میں چھپی تھی اور اس کے ۲۲۰ صفحات تھے، فی صفحہ ۱۹ سطریں تھیں۔ کاغذ معمولی تھا اور لکھائی چھپائی بھی کچھ بہتر نہ تھی، کتابت کی غلطیاں بھی کتاب میں رہ گئی تھیں جن کے لیے مولانا کو آخر میں غلط نامہ لگانا پڑا تھا۔ چونکہ اردو میں اپنی طرز کی یہ پہلی سوانح عمری تھی اس لیے ہاتھوں ہاتھ نکل گئی اور ایک ہی سال بعد ۱۸۸۷ع میں اس کا دوسرا ایڈیشن مولانا نے ۱۸ × ۸/۲۲ کی تقطیع پر شائع کیا۔ تیسرا ایڈیشن اسی تقطیع پر ۱۸۸۸ع میں مجتبائی پریس لاہور سے چھپوا کر دہلی سے شائع کیا۔ بس کل تین مرتبہ یہ کتاب مولانا نے خود شائع کی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بہت اچھی فروخت ہو رہی تھی مگر مولانا نے نہایت ایثار سے کام لے کر اسے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو دے دیا تاکہ اس کی فروخت سے مدرسۃالعلوم کو کچھ پیسے مل جائیں۔ مگر بک ڈپو مدرسۃالعلوم کے کارکنوں نے اس پُر منفعت کتاب کو ڈالے رکھا اور اس کا کوئی ایڈیشن شائع نہ کیا۔ جب ہر طرف سے کتاب کی مانگ ہونے لگی تو آٹھ برس کے بعد سنہ ۱۸۹۶ع میں اس کا چوتھا ایڈیشن ۲۰ × ۸/۲۶ کی تقطیع پر علی گڑھ سے شائع کیا، مگر نہایت خراب اور ردی کاغذ پر، بری لکھائی چھپائی کے ساتھ۔ جب کتاب کی مانگ ملک میں بہت زیادہ ہوئی تو مختلف مقامات کے تاجرانِ کتب نے دھڑا دھڑ مولانا سے بغیر پوچھے اس کے ایڈیشن نہایت غلط سلط چھاپ کر روپے کمانے شروع کیے، مگر مولانا نے اپنے اخلاق و مروت کے باعث کسی کو منع نہ کیا اور یہ سلسلہ

اسی طرح چلتا رہا - لیکن یہ بازاری ایڈیشن بالعموم نہایت غلط چھپتے رہے - اشد ضرورت تھی کہ پہلے ایڈیشن کے مطابق اس اعلیٰ درجے کی ادبی اور تنقیدی کتاب کا نیا ایڈیشن نہایت صحت و صفائی کے ساتھ شائقینِ ادب کے مطالعے کے لیے بڑے اہتمام اور احتیاط سے شائع کیا جائے -

میرے پاس اس کتاب کے دوسرے ، تیسرے اور چوتھے ایڈیشن کی ایک ایک کاپی تو موجود تھی مگر پہلا ایڈیشن نہ تھا جس کی میں سنہ ۱۹۱۴ع سے تلاش کر رہا تھا - مولانا حالی کے ذاتی کتب خانے میں بھی (جس کا میں انچارج تھا) اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا کوئی نسخہ نہ تھا - میں اس نایاب ایڈیشن کی تلاش چوالیس سال تک مسلسل کرتا رہا - آخرِ کار اپریل سنہ ۱۹۵۸ع میں بالکل غیر متوقع طور پر میرے نہایت ہی محترم دوست حضرت فاضل زیدی نے نواب شاہ (سندھ) سے یہ ایڈیشن مجھے بھیج دیا - اس عنایت اور مہربانی کے لیے میں جس قدر بھی ان کا شکریہ ادا کروں ، کم ہے -

محترمی جناب سید امتیاز علی تاج ڈائریکٹر مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور آج کل بعض خاص خاص نایاب اور مفید قدیم کتابوں کے جدید ایڈیشن مجلس کی طرف سے شائع کر رہے ہیں (جو بڑا ہی مستحسن کام اور ادبِ اردو کی نہایت ٹھوس خدمت ہے) - جب انھیں معلوم ہوا کہ حیاتِ سعدی کا پہلا ایڈیشن میرے پاس ہے تو انھوں نے اسے نہایت حسن و خوبی اور نفاست کے ساتھ بجنسہ دوبارہ چھاپنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تاکہ وہ اہلِ علم اصحاب کی لائبریریوں کی زینت بن سکے - الحمدللہ آج ناظرینِ کرام سید صاحب محترم کے ارادے کو عملی شکل میں ملاحظہ فرما رہے ہیں -

میں حیاتِ سعدی کے اس اولین ایڈیشن کی نقل نہایت احتیاط کے ساتھ صاحبِ ذوق حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں - اس کی نقل کرتے ہوئے میرے سامنے حیاتِ سعدی کے مختلف ایڈیشن تھے - جہاں جہاں مجھے شبہہ ہوا ہے ، وہاں میں نے دوسرے نسخوں کو دیکھ کر الفاظ اور عبارات کو نہایت صحیح لکھنے کی کوشش کی ہے - جہاں جہاں پہلے ایڈیشن اور بعد کے نسخوں میں اختلاف تھا اسے واضح طور پر بیان کر دیا

ہے - جہاں جہاں کتابت کی غلطیاں تھیں ، اُن کی موقع پر نشان دہی کر دی ہے - جہاں جہاں پہلے ایڈیشن میں بعد والے نسخوں سے کوئی عبارت یا بیان زیادہ تھا اُس کو علیحدہ بتا دیا ہے (تمام کتاب میں ایسے بیانات چھ جگہ آئے ہیں) - پہلے ایڈیشن کے سر ورق پر مولانا نے اُس وقت کے رواج کے مطابق کتاب کے متعلق طویل عبارت تحریر فرمائی ہے ، میں نے اُسے تبرک کے طور پر اُسی طرح رہنے دیا ہے - کتاب کا جو غلط نامہ مولانا نے اس پہلے ایڈیشن کے آخر میں چھاپا تھا (اور اُس عہد میں یہ عام دستور تھا) میں نے اُس کے مطابق کتاب کو درست کر دیا ہے - کتاب کے آخر میں اپنی کتابوں کا جو اشتہار مولانا نے اپنے نام اور اپنے پتے سے دیا تھا ، میں نے اس خیال سے اُسے بھی شاملِ کتاب کر دیا ہے کہ ایک تو یہ نسخہ اولین ایڈیشن کی مکمل نقل ہو ، دوسرے ناظرین کو اس کا بھی علم ہو جائے کہ مولانا نے اُس وقت تک کون کون سی کتابیں تصنیف فرمائی تھیں اور اُن کی اُس وقت کیا کیا قیمتیں تھیں ؟ نیز یہ کہ مولانا اپنے قیامِ دہلی میں کس جگہ رہتے تھے ؟ اس کتاب کی پروف ریڈنگ بھی بڑی احتیاط سے کی گئی ہے تاکہ نقل اصل کے عین مطابق ہو - جہاں جہاں مولانا نے الفاظ اُس وقت کے رسم الخط کے مطابق لکھے تھے ، میں نے اس ایڈیشن میں اُن کو عبارت میں ایک لفظ کی کمی بیشی کیے بغیر موجودہ رسم الخط میں لکھا ہے ، تاکہ ناظرین کتاب کو آسانی اور سہولت سے پڑھ سکیں - غرض میں نے پوری کوشش اس امر کی کی ہے کہ اس ایڈیشن کو بہتر سے بہتر صورت میں مرتب کروں - خدا کرے میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہوں -

خاکسار

محمد اسماعیل پانی پتی

رام گلی نمبر ۳ - لاہور

مورخہ ۲۶ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

حالاتِ مؤلف

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء (مطابق ۱۲۵۳ھ) میں بمقام پانی پت، ضلع کرنال پیدا ہوئے۔ ان کے مُورثِ اعلیٰ خواجہ ملک علی صاحب، ہرات سے واردِ ہند ہوئے تھے۔ شاہی دربار میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور حسنِ خدمات کے صلے میں پانی پت اور اس کا ملحقہ علاقہ خواجہ ملک علی صاحب کو بصیغۂ مددِ معاش دیا گیا۔ آپ اس علاقے کے منصبِ قضا پر بھی فائز ہوئے۔

مولانا حالی اجداد کی جانب سے انصاری تھے لیکن والدۂ ماجدہ سادات سے تھیں۔ خواجہ الطاف حسین کی کم سنی میں ہی ان کے والد انتقال فرما گئے۔ اس کے کچھ زمانے کے بعد، جب کہ آپ کی عمر صرف نو سال کی ہی تھی، آپ کی والدہ نے بھی رحلت اختیار فرمائی۔ پانی پت میں رہ کر آپ نے فارسی، سید جعفر علی صاحب سے اور عربی، مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری صاحب سے پڑھی۔ ۱۷ سال کی عمر میں آپ کا عقد نکاح ایک دولت مند گھرانے میں ہوگیا، لیکن یہ بندھن آپ کو تحصیلِ علم کے لیے مانع نہ آیا اور آپ کو اکتسابِ علم کا شوق کشاں کشاں دہلی لے پہنچا، جہاں ۱۸۵۵ء تک علومِ منطق و فلسفہ اور عربی کی سندِ فضیلت حاصل کی۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار کی کلکٹری میں آپ ایک قلیل مشاہرے پر ملازم ہوگئے، لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ ۱۸۶۳ء میں مولانا حالی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی خدمت میں پہنچ گئے جہاں ان کی وفات تک ۷ سال کا زمانہ گزارا۔

اس کے بعد آپ گورنمنٹ پنجاب کے لاہور بک ڈپو میں ملازم ہو گئے ، جہاں چھپنے والی کتابوں کی اصلاحِ زبان کا کام آپ کے سپرد ہوا - اس کے بعد ان کا تقرر اینگلو عربک اسکول دہلی میں ہوگیا اور آپ لاہور سے دہلی پہنچ گئے -

نواب سر آسمان جاہ مدارالمہام سلطنتِ آصفیہ ، علی گڑھ پہنچے تو سر سید احمد خاں نے مولانا حالی کو ان کی خدمت میں پیش کیا - نواب صاحب نے مولانا حالی کے لیے ۷۵ روپے ماہوار علمی وظیفہ مقرر کر کے ان کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیا - ۱۳۰۹ھ میں جب علی گڑھ ڈپوٹیشن حیدرآباد پہنچا تو حالی اس کے ایک رکن تھے - اس مرتبہ اعلیٰ حضرت نے مولانا کا وظیفہ ۷۵ روپے سے ۱۰۰ روپے ماہوار کر دیا - فکرِ معاش سے آزاد ہو کر مولانا نے اپنی توجہ تصنیف و تالیف کی جانب مبذول فرمائی -

۱۸۷۴ع میں کرنل ہال رائڈ ، ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے لاہور میں جدید اردو شاعری کے سلسلے میں مشاعروں کی بنا ڈالی - اس تحریک کے سرگرم رکن مولانا محمد حسین آزاد تھے - حالی کو اپنے جذبۂ فطری کی مشق کا موقع مل گیا ؛ چنانچہ ان کی چار مشہور نظمیں (۱) برکھا رت (۲) نشاطِ امید (۳) مناظرۂ رحم و انصاف اور (۴) حبِ وطن ، انھی مشاعروں کی یادگار ہیں - لاہور سے دہلی پہنچ کر بھی مولانا حالی اسی طرح نئی طرز کی نظمیں لکھتے رہے اور پھر بالآخر سر سید احمد خاں کی تحریک پر ۱۸۷۹ع میں اپنا مشہور قومی مسدس تصنیف فرمایا - مولانا حالی نے اس ''مسدس مد و جزر اسلام'' کے بعد کوئی عاشقانہ غزل نہیں کہی - مولانا نے اس نظم کے بعد متعدد نیچرل اور اصلاحی نظمیں ، مثلاً آزادی کی قدر ، قحط اہل اللہ ، بے تمیزیِ ابنائے زماں ، نیشن کی تعریف ، استفادہ ، اسراف وغیرہ لکھیں -

نظموں کے علاوہ مولانا حالی نے رباعیات میں بھی جودتِ طبع کا مظاہرہ فرمایا - ان کی رباعیات کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا - سیماب اکبر آبادی رباعیاتِ حالی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں : ''ہم رباعیوں کے متعلق صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ فارسی میں عمرخیام کی رباعیات نے جو شہرت حاصل کی وہ شاید مولانا حالی کی رباعیوں کے مرتبے کو نہ پہنچ سکی - رباعیاتِ حالی کا ترجمہ عمر خیام کی رباعیوں کی طرح انگریزی میں بھی کئی مرتبہ ہو چکا ہے ، لیکن درجۂ امتیاز ، جو ان رباعیوں کو حاصل ہے ، وہ یہ ہے کہ آج قوم کا بچہ بچہ ان سے فیض اور حظ آٹھا رہا ہے - گھروں میں لڑکیاں پڑھ کر ان سے اپنے اخلاق کو سنوار رہی ہیں اور سکولوں میں طلبا ان سے سبقِ عبرت لے رہے ہیں - رباعیوں میں برجستگی اور ایجاز و اختصار کی بہت ضرورت ہوا کرتی ہے ، وہ سب مولانا کی رباعیوں میں موجود ہیں -''

مولانا حالی کی اکثر نظمیں ان کی حیات ہی میں شائع ہوئیں اور ان کے بعد لاتعداد مرتبہ شائع ہو چکی ہیں - آپ کا کلام کسی کے حق میں محفوظ نہیں تھا - جس مطبع نے چاہا چھاپا اور جو مطبع چاہتا ہے چھاپ لیتا ہے -

مولانا حالی جدید اردو شاعری ہی کے علم بردار نہیں تھے بلکہ جدید اردو نثر کے بھی بے مثل ادیب تھے - آپ نے ۲۰ سال کی عمر میں بزبان عربی ایک رسالہ نواب صدیق حسن خاں بہادر کی تائید میں تحریر فرمایا تھا جو شائع نہیں ہو سکا -

حالی کی تصانیفِ نثر :

(۱) تریاقِ مسموم : پادری عمادالدین کی کتاب 'ہدایت المسلمین' کے رد میں - مطبوعہ ۱۸۶۷ع مطابق ۱۲۸۴ھ -

(۲) طباق الارض : عربی سے ترجمہ - مطبوعہ ۱۸۶۸ع -

(۳) اصولِ فارسی : مطبوعہ ۱۸۶۸ع -
(۴) مولود شریف : تصنیف قبل ۱۸۷۰ع، مطبوعہ ۱۹۳۲ع -
(۵) تاریخِ محمدی پر منصفانہ رائے : مطبوعہ ۱۸۷۲ع ، مطابق ۱۲۸۹ھ -
(۶) شواہد الالہام -
(۷) مجالس النساء (دو حصے) : مطبوعہ ۱۸۷۴ع -
(۸) سوانخ عمری حکیم ناصر خسرو علوی : ۱۸۸۲ع مطابق ۱۲۹۹ھ -
(۹) حیاتِ سعدی : مطبوعہ ۱۸۸۶ع -
(۱۰) مقدمۂ دیوانِ حالی : مطبوعہ ۱۸۹۳ع -
(۱۱) یادگارِ غالب : مطبوعہ ۱۸۹۶ع -
(۱۲) حیاتِ جاوید : مطبوعہ ۱۹۰۱ع -
(۱۳) سوانخ عمری مولانا عبدالرحمان محدث پانی پتی -
(۱۴) مضامینِ حالی -
(۱۵) مقالاتِ حالی -
(۱۶) مکتوباتِ حالی -

حالی کی تصانیفِ نظم :

(۱) برکھا رت (۱۸۷۴ع) -
(۲) نشاطِ امید (۱۸۷۴ع) -
(۳) رحم و انصاف (۱۸۷۵ع) -
(۴) حبِ وطن (۱۸۷۵ع) -
(۵) مسدس مد و جزر اسلام (۱۸۷۹ع) -
(۶) شکوۂ ہند (۱۸۸۶ع) -
(۷) مناجاتِ بیوہ (۱۸۸۷ع) -
(۸) دیوانِ حالی (۱۸۹۳ع) -

(۹) چپ کی داد (۱۹۰۵ع) -

(۱۰) رباعیاتِ حالی (۱۹۱۸ع) -

مولانا حالی کے والدین شیعہ تھے لیکن مرحوم نے اہلِ سنت والجماعت کا مسلک اختیار فرمایا - ان کی اولاد اور خاندان میں ابھی تک دونوں عقاید کے اصحاب پائے جاتے ہیں - مولانا حالی ایک صلح کُل اور غیر متعصب شخص تھے - ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ع کو آپ نے انتقال فرمایا -

حیاتِ سعدی :

مولانا حالی اردو زبان میں سوانح نگاری کے امام ہیں - ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب سوانح نگاری کی مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں : ''یہاں اتنے عظیم الشان کام کی مشکلات سے عہدہ بر آ ہونے کی عزت صرف حالی کے حصے میں آئی - یہی وجہ ہے کہ ہم اردو میں فنِ سوانح نگاری کی امامت کا مستحق بھی انھیں کو سمجھتے ہیں - عام طور پر تاریخِ ادب کے مصنفین نے اردو میں بیاگرافی لکھنے والوں کی تعداد دو حضرات تک ہی محدود رکھی ہے ؛ یعنی مولانا حالی اور مولانا شبلی ، لیکن ایک حیثیت سے ہم اس تعداد کو بڑھا کر چار تک لے جا سکتے ہیں ؛ یعنی ان کے ساتھ شرر اور مولوی چراغ علی کے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں - اگرچہ صحیح معنوں میں مولانا حالی ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے اپنا اکثر وقت اور اپنی اکثر توجہ سوانح نگاری کی طرف مبذول کی -''

(مولانا حالی کی کتبِ سوانح ، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۷ع) -

مولانا حالی نے تین سوانح عمریاں لکھی ہیں :

(۱) حیاتِ سعدی (۲) یادگارِ غالب (۳) حیاتِ جاوید -

حیاتِ سعدی کی تصنیف سے ۱۸۸۵ع میں فراغت پائی اور اس

کی اشاعتِ اول ۱۸۸۶ع میں ہوئی ۔

مولانا حالی نے جس وقت حیاتِ سعدی تصنیف فرمائی ، اُس وقت تک سعدی کے حالات مرتّب نہیں ہوئے تھے ۔ مولانا حالی کے پیشِ نظر صرف شعرا کے تذکرے اور کلیاتِ سعدی کا دیباچہ تھا ۔ انہیں سامنے رکھ کر حالی نے اتنی عظیم الشان کتاب تصنیف کر ڈالی کہ مولانا شبلی نے جب 'شعر العجم' میں سعدی کا عنوان قائم کیا تو لکھا :

''مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے 'حیاتِ سعدی' میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے ، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا ۔'' (شعرالعجم ، حصہ دوم)

حیاتِ سعدی کے ماخذ :

(۱) شعرا کے تذکرے : خاص طور پر سر گوراوسلی کا تذکرہ ۔

(۲) معاصرانہ تاریخیں ۔

(۳) کلیاتِ شیخ سعدی : مخطوطہ مخزونہ کتاب خانۂ دیوانِ ہند ، لندن (۱۱۱۷) ، سنہِ کتابت ۷۲۸ھ ۔ یعنی شیخ سعدی کی وفات (۶۹۱ھ) کے ۳۶ سال بعد ابوبکر بن علی بن احمد نے شیخ کے اصل نسخے سے نقل کیا ۔ چنانچہ وہ ترقیمے میں لکھتے ہیں : ''منقول من خط الشیخ العارف السعدی ۔'' اس کلیات کے مقدمے میں علی ابن احمد نے شیخ کے کچھ حالات اور تصانیف کے متعلق لکھا ہے ۔

مولانا حالی کی کتاب دو باب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے ۔ پہلا باب سوانحِ حیات پر اور دوسرا تصانیف کی تفصیل و تبصرے کے لیے وقف ہے ۔ خاتمے میں عام حالات اور شاعری پر بالاجمال

نظر ڈالی گئی ہے ۔

حیاتِ سعدی میں مندرج کچھ معلومات اگرچہ بعد کی تحقیقات کی رو سے کسی حد تک ساقط الاعتبار ہو گئی ہیں (دیکھیے سعدی نامہ از حبیب یغمائی ، مطبوعہ تہران) ، لیکن جس وقت حالی نے یہ کتاب لکھی تھی تو اربابِ فضل و کمال کے سامنے بہت ہی تھوڑا مواد منتشر صورت میں تھا ۔ اس کے بعد سعدی کے حالات کی جانب توجہ کی گئی اور تحقیقات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ۔ لیکن اس لحاظ سے شرفِ تقدم مولانا حالی کو ہی حاصل رہے گا کہ ان کی یہ کتاب سعدی کے حالات پر اولین کارنامہ ہے جو اہلِ علم کے سامنے آیا ۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو گا کہ برِ صغیر پاک و ہند کے مختلف مطابع نے اس کے لاتعداد ایڈیشن شائع کیے اور زمانۂ تصنیف سے آج تک یہ کتاب مختلف نصابوں میں شامل رہی ہے ۔ اس کا فارسی ترجمہ بھی سروش نے کیا جو تہران سے مکتبۂ دانش نے ۱۳۱۶ھ میں شائع کیا ۔

الغرض مولانا حالی کے مخصوص اسلوبِ نگارش ، وقیع معلومات اور سعدی پر اولیں تحقیقی کارنامے کے اعتبار سے یہ کتاب اردو ادب کا وہ جوہرِ گراں مایہ ہے جس کی تابناکی میں مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا ۔

کارپردازانِ

مجلس ترقیِ ادب

لاہور

فہرست

ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحراً

حیاتِ سعدی

یعنی شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری اور ان کی تمام نظم و نثر پر جدا جدا ریویو ، جس میں شیخ کی ابتداے عمر سے وفات تک کا حال ، جس قدر معلوم ہو سکتا تھا ، ترتیب وار لکھا گیا ہے اور اُس کے کلام کی اصلی خوبیاں واضح طور پر جتائی گئی ہیں ، اور اس کا مقابلہ ایران کے بعض نامور شعراء کے کلام سے کیا گیا ہے ، اور جو فرق شیخ اور دیگر شعراء کی شاعری میں ہے ، اُس کو جہاں تک ممکن تھا نہایت روشن بیان میں ظاہر کیا گیا ہے -

*

مرتّبہ

خاکسار الطاف حسین پانی پتی مقیم دہلی متخلص بہ حالی

۱۸۸۶ء

مطبع انصاری واقع دہلی میں چھپی

*

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

مشہور آدمیوں کا حال لکھنا ، جس کو یونانی میں بیوگریفی اور عربی میں ترجمہ یا تذکرہ کہتے ہیں ، کم و بیش قدیم زمانے سے چلا آتا ہے ۔ اگرچہ اُس وقت زیادہ تر بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے لوگوں کو اکثر زبانی یاد ہوتے تھے جو مناسب موقعوں پر بیان کیے جاتے تھے ، لیکن یہودیوں کے ہاں قدما کی سرگزشتیں لکھی بھی جاتی تھیں ۔ یہودیوں کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے اس طرف توجہ کی ۔ چنانچہ یونان کے مشہور بیوگریفر پلوٹارک کی بیوگریفی ، جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی ، اُس عہد کے تذکروں میں ممتاز اور برگزیدہ ہے ۔ اور عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر میں اُس زمانے کے اولیا ، شہدا اور مجتہدوں کی سوانح عمریاں ، جو کسی قدر مکمل ہیں ، کثرت سے موجود ہیں ۔ زمانۂ متوسط میں مسلمانوں کی بیوگریفی سب سے زیادہ وقعت کے قابل ہے ۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں تذکرہ لکھنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے حالات محض بطور روایت کے بیان کرتے تھے ، درایت کو اس میں کچھ دخل نہ دیتے تھے ، اور بیان میں مبالغے کو زیادہ کام میں لاتے تھے ۔ مسلمانوں کی بیوگریفی میں بھی یہی عام خاصیت پائی جاتی ہے ۔ صرف رجالِ حدیث کے حالات ، جو محدثین نے لکھے ہیں ، اُن میں البتہ بہت احتیاط کی گئی ہے ۔ ہر ایک شخص

کے اخلاق اور خصائل راست راست بے کم و کاست لکھے گئے ہیں اور ان کے عیب اور خوبیاں پوست کندہ بیان کی گئی ہیں - باقی علما اور شعرا وغیرہ کے تذکرے ایسے نہیں ہیں۔ اور چونکہ تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل اور روایت پر تھا ، اس لیے ان لوگوں کے سوا جن کے حالات تاریخ میں مفصل لکھے گئے ہیں (جیسے خلفا ، سلاطین ، وزرا اور سپہ سالار وغیرہ) باقی تمام اہل کمال کے حالات مختصر طور پر تحریر کیے ہوئے ہیں اور مشہور سے مشہور مصنف کی لائف جداگانہ نہیں لکھی گئی -۔زمانۂ حال میں یورپ کے مورخوں نے ، خاص کر سترھویں صدی سے بیوگریفی کو بے انتہا ترقی دی ہے - یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بیوگریفی نے بھی فلسفے کی شکل اختیار کی ہے - حال کی بیوگریفی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں - مصنف کے کلام میں خوض کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں - اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے -

بیوگریفی اُن بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جو انسان کی آیندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعیِ جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں - خصوصاً جو قومیں علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجے کو پہنچ جاتی ہیں ان کے لیے بیوگریفی ایک تازیانہ ہے جو اُن کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے - جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال

ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات صرف کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچایا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ لوتھر[1] کے دل میں جو ایک غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی اور بنجمن فرینکلن[2] نے نہایت پست حالت سے اعلیٰ درجے کی ترقی اور شہرت حاصل کی، اس کا بڑا سبب یہی بیوگریفی کا مطالعہ تھا۔ بیوگریفی علم اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سود مند ہے۔ کیونکہ علم اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور بیوگریفی سے اکثر نیکی کے کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسلاف کے ستودہ کاموں کی ریس کرنے کا شوق دامن گیر ہوتا ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ "بیوگریفی چلّا چلّا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو۔" ہمارے ملک میں بیوگریفی کی طرف اب تک کچھ توجہ نہیں ہوئی۔ ملک کی عام زبان یعنی اردو میں اب تک یا تو یورپ کے بعض مشہور لوگوں کے حالات انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں، یا ایسے لوگوں کے سوانح لکھے گئے ہیں جن کے حالات پڑھ کر

۱۔ لوتھر جرمنی کا رہنے والا عیسائی مذہب کا ایک مشہور مصلح اور تمام یورپ کو پوپ کے پنجے سے نجات دینے والا ہے۔ ۱۴۸۳ع میں پیدا ہوا، ۱۵۴۶ع میں فوت ہوا۔

۲۔ یہ شخص امریکہ کا ایک مشہور فاضل ہے جس نے سب سے اول علم برق کے اصول دریافت کیے ہیں۔ ۱۷۰۶ع میں بمقام بوسٹن پیدا ہوا اور ۱۷۹۰ع میں فوت ہوا۔

کوئی عمدہ تحریک دل میں پیدا نہیں ہوتی - ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کے اکابر و اسلاف میں بھی ایسے بہت سے افراد نکلیں گے جن کے بڑے بڑے کام اور ان کے کمالات قوم کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور موجودہ نسلوں کا فرض ہے کہ ان کا نام زندہ کرنے اور آیندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے ان کے فضائل اور کمالات دنیا میں شائع کریں ، مگر مشکل یہ ہے کہ قدما میں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں ان کے بھی مفصل حالات دستیاب ہونے سخت دشوار بلکہ ناممکن ہیں - صرف تذکروں میں کچھ کچھ مختصر حال درج ہے ، لیکن اس سے کسی کی لائف ترتیب وار لکھنی ہرگز ممکن نہیں -

ہم نے اس خیال سے کہ شیخ سعدی شیرازی کا نام حد سے زیادہ مشہور ہے ، شاید ان کے مفصل حالات بہم پہنچ جائیں ، ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس غرض سے اکثر فارسی تذکرے جو یہاں مل سکتے ہیں دیکھے اور ایک انگریزی تذکرہ سرگورا وسلی[۱] صاحب کا بھی دیکھا ، مگر ان تمام تذکروں میں

۱- یہ صاحب ۱۷۸۷ع میں ، جب کہ مارکوئس ولزلی صاحب گورنر جنرل تھے ، بطریق سیاحت ہندوستان میں آئے تھے - شدہ شدہ لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے ہاں نوکر ہو گئے - پھر گورنمنٹ کی طرف سے ایران میں سفیر مقرر ہو کر گئے - سفارت کے زمانے میں ایک تذکرہ ایران کے مشہور شاعروں کا جن میں شیخ بھی شامل ہے ، انھوں نے بہت کوشش سے لکھا تھا -

---

۱- معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے - لارڈ ولزلی ۱۷۹۸ع میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا اور سعادت علی خاں ۱۷۹۸ع میں تخت نشین ہوئے تھے - (محمد اسماعیل پانی پتی) -

زیادہ تر وہی شیخ کی مشہور نقلیں اور حکایتیں ، جو زبان زد خاص و عام ہیں ، تھوڑے تفاوت کے ساتھ مندرج پائیں - شیخ کی تصنیفات پر بھی اجمالی تعریف کے سوا کسی نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے اس کے کلام کی عظمت اور واقعی خوبیاں معلوم ہوں - اگرچہ یہ تمام باتیں مایوس کرنے والی تھیں مگر ہم نے اپنے ارادے کو جس طرح ہو سکا پورا کیا - جس قدر صحیح اور معقول باتیں تذکروں سے معلوم ہو سکتی تھیں ، ان کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کیے اور نیز اُس عہد کی تاریخ کے اکثر واقعات کا سراغ لگایا اور کچھ باتیں علی بن احمد جامع کلیات شیخ کے دیباچے سے اخذ کیں اور کچھ کچھ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی اور ان تمام معلومات کو جہاں تک ممکن تھا ، لائف کی صورت میں مرتّب کیا اور شیخ کی تصنیفات کے بیان میں زیادہ تر اپنی ناچیز رائے اور تفحّص پر بھروسا کر کے یہ مضمون ختم کیا گیا - اگرچہ شیخ کی اصل سرگزشت میں ، جس قدر کہ وہ اب تک معلوم ہوئی ہے ، کوئی عظیم الشان واقعہ نہیں ہے ، لیکن جس ترتیب کے ساتھ اس کے پراگندہ حال جمع کرکے اس کتاب میں لکھے گئے ہیں اور جس طریقے سے اس کی عمدہ تصنیفات اور پاکیزہ خیالات پر بحث کی گئی ہے ، اس سے امید کی جاتی ہے کہ عام ناظرین کے لیے اس کا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا اور خاص کر شعرا کو اس سے کسی قدر بصیرت اور نصیحت بھی حاصل ہوگی -

اس کتاب کے دو باب اور ایک خاتمہ ہے - پہلے باب میں شیخ کی سوانح عمری کا بیان ہے اور دوسرے باب میں اس کی تصنیفات کا مفصل ذکر ہے اور خاتمے میں اس کے عام حالات اور شاعری پر بالاجمال نظر کی گئی ہے - اگرچہ اسلام کے قدیم مصنفوں میں

بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی عظمت اور جلالت کے سامنے شیخ کو کچھ رتبہ نہیں ہے مگر ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لیے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنف مقبول اور مشہور نہیں ہے، اور خاص کر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اس کے رتبے کو نہیں پہنچا۔ لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو ہمارا ارادہ ہے کہ اور بھی چند مشہور اور ذی وقعت مصنفوں کی سوانح عمریاں اور ان کی تصنیفات کا بیان جدا جدا لکھیں گے۔ السعی منّا والاتمام من اللہ

اعتذار[1]

شیخ جس طرح طبقۂ شعرا و مصنفین میں ممتاز سمجھا گیا ہے اسی طرح مشائخ و عرفا کی مجلس میں اس کو احترام کے ساتھ جگہ دی گئی ہے، لیکن چونکہ ہم کمالات باطنی کے دیکھنے اور پرکھنے کی آنکھ نہیں رکھتے اس لیے اس کتاب میں صرف بہ حیثیت شاعری اس کا ذکر کیا گیا ہے اور اپنے تئیں اس لائق نہیں سمجھا گیا کہ دوسری حیثیت سے اس کے باب میں قدر ضرورت سے زیادہ چون و چرا کی جائے۔

دوسرے ہماری زبان میں، جیسا کہ ظاہر ہے، کسی کو صیغۂ جمع کے ساتھ ذکر کرنا عموماً اس کی تعظیم کی علامت سمجھی جاتی ہے اور صیغۂ مفرد کا استعمال خلاف تعظیم خیال کیا جاتا ہے، مگر میں نے اس مضمون میں باوجودیکہ شیخ کی عظمت مجھ سے بڑھ کر بہت کم لوگوں کے دل میں ہوگی، اس کو برابر فعل مفرد اور ضمیر مفرد کے ساتھ یاد کیا ہے، کیونکہ میری رائے یہ ہے کہ جو شخص کسی کتاب کا موضوع یا ہیرو ہو اس کو خاص خاص حالتوں کے سوا ہمیشہ صیغۂ مفرد کے ساتھ ذکر کرنا ہی اس کی بڑی تعظیم ہے۔ پس اس عنوان کو جو میں نے اختیار کیا ہے، ترک تعظیم پر نہیں بلکہ فرط تعظیم پر محمول کرنا چاہیے۔

۱۔ 'اعتذار' کے عنوان سے جو عبارت مولانا نے پہلے ایڈیشن میں لکھی ہے وہ بعد کے کسی ایڈیشن میں نہیں پائی جاتی۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

پہلا باب

شیخ کی سوانح عمری .

شیخ کی سرگزشت بیان کرنے سے پہلے اس مردم خیز خطے کا مختصر حال لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا جس کی خاک سے ایسا مفید اور مقبول مصنف پیدا ہوا اور جہاں سے علما و شعرا اور جلیل القدر مصنفوں کی ایک جماعت کثیر عروج اسلام کے ہر طبقے اور ہر صدی میں ظہور کرتی رہی ہے -

فارس اور شیراز کا حال :

ایران کے جنوب مغربی حصے میں خلیج فارس کے کنارے پر پارس[1] ایک خطہ ہے جس کو عرب فارس کہتے ہیں - قدیم زمانے میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے لیکن اب خاص حصے کو پارس کہا جاتا ہے - اس چھوٹی سی ولایت میں بہت سی قدرتی اور قدیم مصنوعی چیزیں ایسی ہیں کہ اس کو دنیا کا نمونہ کہا جا سکتا ہے - تقریباً آدھا ملک پہاڑی اور آدھا میدانی ہے اور جنوبی حد پر سمندر ، یعنی خلیج فارس ہے - آب و ہوا کہیں نہایت گرم ہے اور کہیں نہایت سرد ہے - اکثر صحرا سرسبز و شاداب ہیں - جا بجا چشمے اور ندیاں جاری ہیں - صحرائے شاپور میں ، جو کہ شیراز

۱- پارس ، جیسا کہ 'فرہنگ ناصری' میں لکھا ہے ، ہوشنگ کے بیٹے کا نام تھا - اسی کے نام سے قدیم زمانے میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے اور اہل یورپ اب بھی تمام ایران کو اسی لیے پرشیا یعنی پارس کہتے ہیں ، لیکن جب سے کہ ایران کے ہر ایک صوبے اور ولایت کا جدا نام رکھا گیا ، اس وقت سے پارس اس خاص ولایت کو کہنے لگے -

کے نواح میں ہے ، ایک وسیع قطعہ ہے ، جس کا نام ِشعب بوّان ہے ۔ عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں چار تفرّج گاہیں ایسی ہیں جن کی کہیں نظیر نہیں ۔ صُغد سمرقند[1] ، غُوطۂ دمشق ، نہر آبُلّہ اور ِشعب بوّان ۔ اتابک ابوبکر بن سعد زنگی ، جس کے عہد حکومت میں شیخ نے 'گلستاں' لکھی ہے ، ہمیشہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ میرے ملک میں دو چیزیں ایسی ہیں جو خوف اور اطمینان کی حالت میں بادشاہوں کے لیے ناگزیر ہیں ۔ خوف کی حالت میں قلعۂ سفید اور اطمینان کی حالت میں نزہت گاہ ِشعب بوّان ۔ اکثر شعرائے عرب نے اس قطعے کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں ۔ جن میں سے سلامی شاعر کا قصیدہ جو عضدالدولہ دیلمی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا ، بہت مشہور ہے ۔ ایک اور شاعر کہتا ہے :

اِذَا اَشْرَفَ الْمَحْزُوْنُ مِنْ رَاْسِ قَلْعَةٍ

عَلَیٰ شِعْبِ بَوَّانَ اسْتَرَاحَ مِنَ الْکَرْبِ

ترجمہ : جب غمگین آدمی قلعے پر سے ِشعب بوّان کی فضا کو دیکھتا ہے تو اس کی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں ۔

فارس کے میوے عراقِ عجم میں جاتے ہیں ۔ گرم پانی

۱۔ صُغد معرّب ۔ صُغد نشیب کی زمین اور صُغد سمرقند ایک نزہت گاہ سمرقند کے قریب تھی ۔ غُوطہ بھی نشیب کی زمین کو کہتے ہیں اور غُوطۂ دمشق ایک سیرگاہ دمشق میں تھی ۔ آبُلّہ بصرہ میں ایک پُرفضا مقام تھا ۔ وہاں ایک ندی تھی ، اس کو نہر آبُلّہ کہتے تھے ۔ یہ تینوں مقام اور ِشعب بوّان دنیا کے چار بہشت سمجھے جاتے تھے ۔

کے چشمے اور مفید کانیں فارس میں موجود ہیں۔ فارس کے آثار قدیمہ دنیا کے اُن عجائبات میں سے ہیں جن کو اگلے زمانے کے لوگ جِنّ اور پری کے کام سمجھتے تھے۔ جیسے تختِ جمشید، نقشِ شاپور، دخمۂ فریدوں اور خانۂ زردشت۔ ان کا مفصل حال ایران کی انگریزی تاریخوں میں مذکور ہے۔ انھیں آثار قدیمہ کی نسبت عُرفی شیرازی نے کہا ہے:

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدیدست صنادیدِ عجم را

اس کے سوا اور بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے انسان کے قویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں؛ جیسے یزد، میبذ، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ۔ ان شہروں میں کثرت سے علما و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں، جن کی تصنیفات مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پایۂ تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قُم کو دارالمؤمنین اور یزد کو دارالعباد کا خطاب دیا ہے، اسی طرح شیراز کو دارالعلم کے لقب سے ملقّب کیا ہے۔ اگرچہ شیراز کا علم و فضل زمانے کے انقلاب اور سلطنتِ اسلامیہ کے تنزل سے اب نہایت پست حالت میں ہے، لیکن اس کی موجودہ نسلوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدیم بزرگی اور برتری کے نشے میں اب تک بدمست ہیں۔ حاجی لطف علی خاں آذر نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ "شیراز کے چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے صحبت اور جلسوں پر فریفتہ ہیں۔ کسبِ معاش اس قدر کرتے ہیں کہ کسی کے محتاج نہ ہوں۔ تھوڑی سی آمدنی پر قانع رہتے ہیں اور ہمیشہ سیرگاہوں اور قہوہ خانوں میں جمع

ہوتے ہیں ۔"

شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانے میں پڑی ہے ۔ محمد بن قاسم ، جس نے مسلمانوں میں سب سے اول ہندوستان پر لشکر کشی کی ہے ، شیراز کا بانی ہے ۔ یہ شہر پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ایک نہایت سرسبز و شاداب قطعۂ زمین پر آباد کیا گیا ہے ۔ 'تقویم البلدان' میں لکھا ہے کہ " شیراز کے مکانات بہت وسیع اور بازار پُر رونق ہیں اور گھر گھر نہر جاری ہے ۔ شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو ۔" پھر صفّاریوں[1] اور دیلمیوں[2] کے عہد میں شیراز نے اور بھی زیادہ وسعت اور رونق حاصل کی ۔ عضدالدولہ دیلمی کے زمانے میں اس کی آبادی اس درجے کو پہنچی کہ شہر میں اہل لشکر کی گنجائش نہ رہی اور شہر کے باہر ایک جدید عمارت بنائی گئی جس کا نام 'سوق الامیر' رکھا گیا اور اس کے بیٹے صمصام الدولہ نے اس جدید عمارت کے گرد پختہ فصیل کھنچوائی ۔

شیراز کی آب و ہوا نہ زیادہ گرم ہے ، نہ زیادہ سرد ، بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہے ۔ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ اور اکثر پرانے اور نئے شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں ۔ ازاں جملہ خواجہ حافظ کا یہ شعر مشہور ہے :

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رکناباد و گلگشتِ مصلیٰ را

شیخ علی حزیں نے بارھویں صدی ہجری میں جب کہ شیراز کی رونق بالکل جا چکی تھی ، اس کو دیکھا ہے ۔ وہ اپنی سوانح عمری

۱۔ صفّاریوں میں تین بادشاہ ہوئے ہیں ، چالیس برس ان کی سلطنت رہی ۔
۲۔ دیلمیوں میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے ، جن کی حکومت ۲۴۸ برس رہی ۔

میں اس کی بہت سی تعریف کے بعد لکھتا ہے کہ ''شیراز کی آب و ہوا دماغ کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتی ہے ، جس قدر چاہو کتاب کے مطالعے اور فکر و غورِ مضامین میں مصروف رہو ، کبھی جی نہ اکتائے گا ۔''

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارات کی لطافت و خوش اسلوبی باشندوں کے خیالات اور قویٰ پر عجیب اثر رکھتی ہے - یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علما و شعرا پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں - شیخ نے بھی ''بوستان'' کے دیباچے میں اہل شیراز کو ان تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے جن سے وہ حالت سفر میں ملا تھا ۔ شیراز سے جس قدر علما و مشائخ و شعرا اور مصنفین ابتدا سے اخیر تک اٹھے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا مذکور ہے ان کی تعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے ، اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لیے کچھ کم باعثِ افتخار نہ تھا ۔

شیخ کا نام ، نسب ، ولادت اور بچپن :

اس کا نام شرف الدین اور مُصلح لقب اور سعدی تخلص ہے۔ سرگورا وسلی نے اس کی ولادت ۵۸۹ ہجری مطابق ۱۳۳۳ عیسوی میں لکھی ہے مگر تحقیق[1] یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تُکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تُکلہ[2] بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا

۱- اس کی ولادت کا سال کسی نے نہیں لکھا۔ صرف سال وفات سب نے لکھا ہے۔ یعنی سنہ ۶۹۱ھ اور اس کی عمر ۱۰۲ یا ۱۱۰ یا ۱۲۰ برس کی بتائی ہے۔ پس کم سے کم عمر ماننے سے اس کی ولادت ۵۸۹ھ میں قرار پاتی ہے ، لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابوالفرج ابن جوزی ، جو بغداد میں اس کا جلیل القدر استاد تھا ، اس کی وفات کے وقت ، جو کہ قطعاً سنہ ۵۹۷ھ میں ہوئی ہے ، شیخ کی عمر نو برس سے زیادہ نہ ہو اور یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اسی لیے اس کی عمر ۱۰۲ برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔

۲- بوستان میں تُکلہ کو شاہانِ پیشین میں لکھا ہے ، حالانکہ سعدی اس کے وقت میں پیدا ہو لیا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بوستان تکلہ سے چوتھے بادشاہ یعنی ابوبکر کے عہد میں لکھی گئی ہے۔ پس شاہانِ پیشین سے وہ بادشاہ مراد ہیں جو ابوبکر سے پہلے تھے ، نہ وہ جو سعدی سے پہلے تھے۔

اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا، اس لیے اس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے، ایک با خدا اور متورع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ نماز روزے کے مسائل اس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اس کو عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت بہت زیادہ کرتا تھا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ بوستان میں کہتا ہے:

ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت
نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت
بہ خُردی بخورد از بزرگاں قفا
خدا دادش اندر بزرگی صفا

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اس کو کم سن چھوڑ کر مر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کی والدہ نے اس کو تربیت کیا ہوگا، کیونکہ اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اس کی ماں زندہ تھی۔ کئی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ علامہ قطب الدین شیرازی جو کہ محقق طوسی کا شاگرد رشید اور ہلاکو خاں کا مصاحب خاص تھا، شیخ کا ماموں یا قریب کا رشتہ دار تھا۔ مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے باہم ایسی

بے تکلفانہ ہنسی اور چہل ہوتی تھی جو ماموں بھانجوں میں نازیبا معلوم ہوتی ہے - بہرحال شیخ اور علامہ دونوں ہم عصر تھے اور شاید کچھ قرابت بھی رکھتے ہوں -

---

شیخ کی تعلیم کا حال :

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی - اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا ، مگر اس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اس کے قرب و جوار میں علما و مشائخ اور فصحا اور بلغا کی ایک جماعتِ کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور ان سے بھی زیادہ ایک جمّ غفیر کا شُہرہ ، جو خطۂ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے ، بزرگوں سے سنا تھا - قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا ان کی شہرت اور ذکرِ خیر سننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود ان کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے ، اسی لیے تحصیل علم کا شوق اس کو دامن گیر ہوا - اگرچہ دارالعلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا ، علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول تھے ، مدرسۂ عضدیہ ، جو کہ عضدالدولہ دیلمی نے قائم کیا تھا ، اور اس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے ، لیکن اس وقت وہاں ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا - اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل ، رحم دل ، بامروت اور فیاض بادشاہ تھا مگر اس کی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی - اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کی حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالکِ محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا - اس کی غیبت کے زمانے

میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پا کر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے - چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آ کر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا - ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں دشوار بلکہ ناممکن تھی - اس کے علاوہ امن کے زمانے میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں - یہ اسباب تھے جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا - چنانچہ ذیل کے اشعار میں اس نے شیراز سے تنگ آ کر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے :

دلم از صحبتِ شیراز بکلّی بگرفت
وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم

سعدیا! حُبِ وطن گرچہ حدیثے ست صحیح
نتواں مُرد بسختی کہ من ایں جا زادم

ترجمہ : میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آ گیا - اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو - اے سعدی ! وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں ، سختی میں مرا نہیں جاتا -

اس زمانے میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے بلاد اسلام میں جابجا کھلے ہوئے تھے جہاں دور دور سے طالب علم آ کر علم تحصیل کرتے تھے - ہرات ، نیشاپور ، اصفہان ، بصرہ اور بغداد میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلاں کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور معمور تھے - ان کے سوا شام[1] ، عراق اور مصر وغیرہ میں

جگہ جگہ مدرسے جاری تھے ، لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیۂ بغداد نے حاصل کی تھی ، جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے سنہ ۴۵۹ھ میں بنوایا تھا - ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسے سے تعلیم پا کر نکلے ہیں ، جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں - یہ مدرسہ اس قدر نامور تھا کہ جو علما یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے ، پھر ان کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہہ نہ رہتا تھا - امام ابو حامد غزالی ، شیخ عراق عبدالقادر سہروردی ، اُستاد الائمہ ابو حامد عماد الدین موصلی اور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی - شیخ کو اس مدرسے میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوگی کہ اس کا ہم وطن شیخ ابو اسحاق شیرازی ، جس کا علم و فضل شہرۂ آفاق تھا ، مدت تک اس مدرسے کا متولی رہا تھا - جس وقت نظام الملک نے بغداد میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اول یہاں کا

۱- ان میں سے مدرسۂ ناصریہ ملک الناصر صلاح الدین کا بنایا ہوا قبرص میں اور مدرسۂ رواحیہ، رواحہ کے پوتے زکی ابوالقاسم ھبۃ اللہ کا اور نیز مدرسۂ ستِ الشام خاتون بنت ایوب خواہر صلاح الدین کا اور دارالحدیث ملک عادل بن ایوب کا دمشق میں اور مستنصریہ خلیفہ مستنصر باللہ کا بغداد میں اور صاحبیہ وزیر صفی الدین کا قاہرہ میں اور نوریہ نور الدین ارسلان شاہ صاحبِ موصل کا موصل میں بہت مشہور تھے - ان کے سوا جیسا کہ '' تاریخ ابن خلکان '' سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے مدرسے جیسا مدرسۂ ثقفیہ ، قاہریہ ، عزیزیہ ، عِزّیہ ، زینیہ ، نفیسیہ ، علائیہ ، وغیرہ وغیرہ بیت المقدس ، مُوصل ، بغداد ، دمشق اور اسکندریہ وغیرہ میں موجود تھے -

متولی شیخ ابو اسحاق کو مقرر کیا تھا اور اس سبب سے اہل شیراز کو اس مدرسے سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا ۔

الغرض شیخ نے مدرسۂ نظامیہ میں جا کر تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ 'بوستان' میں اس نے تصریح کی ہے ، وہاں سے اس کے لیے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا ۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور شخص علامہ ابوالفرج عبدالرحمان ابن جوزی ہے ، جس کا لقب جمال الدین ہے ۔ یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا ۔ بے شمار کتابیں اس کی تصنیفات سے ہیں ۔ کہتے ہیں اس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے ان کا تراشہ میرے حجرے میں جمع ہے ، مرنے کے بعد جب مجھ کو نہلائیں تو غسل کے لیے اس تراشے سے پانی گرم کریں ۔ چنانچہ اس کی وصیت کے موافق عمل کیا گیا اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا ۔

جس زمانے میں شیخ ، بغداد میں علامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا ، اُس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا ۔ دولت شاہ سمرقندی اور سر گورا وسلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بیعت کی تھی اور اُن سے علمِ تصوف اور طریقِ معرفت و سلوک حاصل کیا اور پہلی مرتبہ انھیں کے ساتھ بیت اللہ کے حج کو گیا ۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی وفات سنہ ۵۶۱ھ میں ، یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی ۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اس کو صحبت رہی ہے اور ایک بار سفرِ دریا میں وہ ان کے ساتھ رہا ہے ۔

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اس کے ہم عمر اور ہم سر لوگ اس کی خوش بیانی اور حسنِ تقریر پر رشک کرتے تھے - چنانچہ ایک بار اس نے اُستاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے ، جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائلِ علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے - اُستاد یہ سن کر شیخ پر غصے ہوا اور یہ کہا کہ اوروں کے رشک و حسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بد گوئی اور غیبت کو برا نہیں سمجھتے - تم دونوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو ، وہ رشک و حسد سے اور تم بدگوئی و غیبت سے -

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ، فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا - طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ برابر وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا اور علامہ ابوالفرج ابن جوزی ہمیشہ اس کو سماع سے منع کرتا تھا ، مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی - لیکن علما کی سوسائٹی آہستہ آہستہ اس کے دل میں گھر کرتی جاتی تھی - آخر ایک روز کسی مجلس میں اس کو ایک بد آواز قوال سے پالا پڑا اور بہ ضرورت ساری رات اس مکروہ صحبت میں بسر ہوئی - صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈاسا اتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوال کے نذر کیں - اصحاب مجلس کو اس حرکت سے تعجب ہوا - شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے - میرا مربی اُستاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا - آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے

میں آنا ہوا اور بزرگوار قوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی ۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کی صحبت سے عالم طالب علمی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اس کے دل سے اتر گئے تھے ۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے میں چلا آیا ۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اس طریقے کو چھوڑ کر اس کوچے میں قدم رکھا ؟ کہا درویش صرف اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور علما یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ڈوبتوں کو بھی بچائیں ۔

شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات جتائی ہے کہ اس کو کسی سرزمین کے ساتھ عراق یا بغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا ۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے :

بعد از عراق جاے خوش نایدم ہواے
ساقی بزن نواے زاں پردۂ عراق

جس زمانے میں شیخ نظامیۂ بغداد میں پڑھتا تھا ، اگرچہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا ، مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی ۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر خلافت پر متمکن تھا اور اس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لیے سنبھالا لیا تھا ۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے ۔ عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے ۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے شہریار اور فرمانروا

بارگاہِ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے ۔ قصر خلافت کے آستانے پر ایک پتھر بمنزلۂ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا ، جس کو امرا اور اعیانِ سلطنت قصرِ خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے ۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی وہاں ایک مدت پہلے سے رستے کے تمام منظر اور بالا خانے کرایہ داروں سے رک جاتے تھے ۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور پھر اسی آنکھ سے اس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا ، جو چھ سو برس بوسہ گاہِ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایۂ اقتدار یورپ ، ایشیا اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بے دریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا ۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اس کی آنکھوں کے روبرو گزرے تھے جو ہلاکو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے ۔ ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک نہایت عمدہ سبق تھا ، جس نے اس کے دل میں قوم کی دل سوزی ، بادشاہوں کی اصلاح ، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقے کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی ۔ مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اس کا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا ۔ اس مرثیے کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنی

مناسب معلوم ہوتی ہیں :

ابیات

١- آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملک مستعصم امیرالمومنین

ترجمہ ١- آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر خون برسائے۔

٢- اے محمد! گر قیامت سے براری سر زخاک
سربر آور ویں قیامت درمیانِ خلق بیں

ترجمہ ٢- اے محمد! (صلعم) اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجیے۔

٣- نازنینانِ حرم را خونِ حلقِ نازنیں
زاستاں بگذشت وما را خونِ دل ازآستیں

ترجمہ ٣- محل کے ناز پروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا۔

٤- زینہار از دورِ گیتی وانقلابِ روزگار
درخیالِ کس نہ گشتے کانچناں گردد چنیں

ترجمہ ٤- دنیا کی گردش اور زمانے کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیے ، یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائے گا۔

٥- دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکتِ بیت الحرام
قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقاں بر زمیں

ترجمہ ٥- جنھوں نے اس بیت الحرام کی شان و شوکت دیکھی

ہے جہاں روم کے قیصر اور چین کے خاقان خاک
پر سر رگڑتے اور زمین پر بیٹھتے تھے ، وہ ذرا آنکھ
اٹھا کر دیکھیں -

۶- خونِ فرزندانِ عمّ ِ مصطفیٰ شد ریختہ
ہم براں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں

ترجمہ ۶- کہ پیغمبر خدا کے بنی عم کا خون اس خاک پر بہہ
گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑتے تھے -

۷- بعد ازیں آسائش از دنیا نباید چشمداشت
قیر در انگشتری ماند چو برخیزد نگیں

ترجمہ ۷- آئندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں چاہیے کیوں
کہ انگوٹھی پر سے جب نگین جاتا رہتا ہے تو
نری کلونس رہ جاتی ہے -

۸- دجلہ خونابست زیں پس گر نہد سر در نشیب
خاکِ نخلستانِ بطحا را کند با خوں عجیں

ترجمہ ۸- دجلہ کا پانی ِ نکتّر لہو ہو گیا ہے - اگر اب جاری
رہے گا تو نخلستانِ بطحا کی خاک کو خون سے
رنگین کردے گا -

۹- نوحہ لائق نیست بر خاکِ شہیداں زانکہ ہست
کمتریں دولت مر ایشاں را بہشتِ برتریں

ترجمہ ۹- شہیدوں کی خاک پر نوحے کی کیا ضرورت ہے ،
کیونکہ ان کے لیے ادنیٰ نعمت فردوس بریں ہے -

۱۰- لیکن از روئے مسلمانی و راہِ مرحمت
مہرباں را دل بسوزد در فراقِ نازنیں

ترجمہ ۱۰- ہاں مگر رحم اور اسلام کی ہمدردی کے سبب
دوست کا دل دوست کی جدائی میں کڑھتا ہے -

۱۱- باش تا فردا کہ بینی روزِ داد و رستخیز
کز لحد باروئے خوں آلودہ بر خیزد دفیں

ترجمہ ۱۱- کل تک صبر کرو ، قیامت کے دن دیکھ لینا کہ
قبر سے اہلِ قبر لہو بھرا منہ لے کر آٹھیں گے -

۱۲- تکیہ بر دنیا نباید کرد و دل بر وے نہاد
کاسماں گاہے بمہرست اے برادر گہ بکیں

ترجمہ ۱۲- یارو دنیا پر بھروسا کرنا اور اس سے دل لگانا
نہیں چاہیے - کیوں کہ آسمان کبھی دوست ہے اور
کبھی دشمن -

۱۳- زورِ بازوے شجاعت بر نیاید با اجل
چوں قضا آید نماند قوتِ رائے رزیں

ترجمہ ۱۳- شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا اور جب
قضا آتی ہے تو رائے صائب کی قوت جاتی رہتی ہے -

۱۴- تیغِ ہندی بر نیاید روزِ ہیجا از نیام
شیر مردے را کہ باشد مرگ پنہاں در کمیں

ترجمہ ۱۴- جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے اس کی اصیل
تلوار لڑائی کے دن میان سے باہر نہیں نکلتی -

۱۵- تجربت بے فائدست آں را کہ برگردید بخت
حملہ آوردن چہ سود آں را کہ برگردید زیں

ترجمہ ۱۵- جب نصیبہ پلٹ گیا ، پھر اس کا امتحان کرنا

بے فائدہ ہے اور جب زین آلٹ گیا پھر حملہ کرنا
فضول ہے -

۱۶- کرگسانند از پۓ مردارِ دنیا جنگجوے
ای برادر! گر خردمندی چو سیمرغاں نشیں

ترجمہ ۱۶:- یارو ! مردار دنیا کے لیے گِدھ آپس میں لڑ رہے ہیں -
اگر تم عقلمند ہو تو سیمرغوں کی طرح الگ بیٹھو -

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا - اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی ، نیکی ، لیاقت اور انصاف بالکل نہ تھا - تکبر اور غرور نے اس کے دماغ کو مختل کر دیا تھا - غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اس کے بیٹے ابوبکر نے اہل سنت کی حمایت اور طرف داری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ، مگر اس نالائق خلیفہ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا ، لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا - مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفریں سمجھو مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے آٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے ، ایک بارگی ان میں تزلزل آ گیا اور چند روز میں ان کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا - پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا ، یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا

مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلعم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آب باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی ، وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا ۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے اور اگر اس موقع پر حسّان بن ثابت موجود ہوتے تو ان کو بھی ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا ۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے :

شعر

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

القصہ شیخ مدرسۂ نظامیہ سے نکل کر مدت دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر سیر و سیاحت کرتا رہا ۔ جب کتاب کے مطالعے سے اس کا جی سیر ہو گیا تو نسخۂ کائنات کا مطالعہ شروع کیا ۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اس نے تیس برس کی عمر تک تحصیل علم کی ہے اور تیس برس سیر و سفر میں اور تیس برس تصنیف و تالیف میں اور تیس برس عزلت نشینی میں بسر کیے ہیں ۔ اگرچہ تیس تیس برس کے چار مساوی حصے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں اور غالباً یہ مضمون منو شاستر سے اخذ کیا گیا ہے جس میں عمر کو ایسے ایسے تین یا چار حصوں پر تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصہ تحصیل علم اور سیر و سفر میں بسر ہوا ۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ ''شیخ عالم صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرۂ کامل رکھتا تھا ۔'' اگرچہ اس کی شہرت طبقۂ علما میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرۂ شعرا میں ہوئی

مگر اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق اور سلجھا ہوا عالم تھا - بعض موقعوں پر فقہا اور قضاۃ کے مجمعوں میں اس کو بحث و مناظرہ کا اتفاق ہوا ہے اور اخیر کو اس کی رائے سب پر غالب رہی ہے - ایک بار غالباً شام یا عراق کے کسی شہر میں جہاں اس کی جان پہچان کم تھی ، کسی تقریب سے قاضیِ شہر کی مجلس میں اس کا گزر ہوا - اس وقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا اور مجلس میں تمام علما و فقہا کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے - شیخ سادگی سے سب کے برابر جا بیٹھا - خدام نے جھڑک کر وہاں سے اٹھا دیا اور مشکل سے پائینِ مجلس جگہ ملی - اس وقت کسی مسئلے میں گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا - شیخ نے دور ہی سے باآواز بلند کہا کہ اگر مجھ کو اجازت ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں - سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہوا - شیخ نے اس مسئلے کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا - چاروں طرف تحسین و آفرین ہونے لگی - قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا - شیخ نے کہا ''یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہیے - جب لوگ مجھ کو بھی مولانا اور صدرِ کبیر کہہ کر پکاریں گے تو غریب آدمی مجھ کو حقیر اور ذلیل معلوم ہوں گے اور پھٹے پرانے کپڑے والوں سے میں بھی تمھاری طرح ناک چڑھاؤں گا -'' اسی طرح اور بہت سے طعن اور ملامت کے الفاظ کہہ کر وہاں سے چل دیا - شیخ نے اپنی یہ سرگزشت بوستان میں اس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر شخص کی سرگزشت ہے مگر اخیر کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خاص اپنی روئداد لکھی ہے -

شیخ کی تحصیل اور مبلغِ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے مگر ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلسفے اور حکمت کی طرف بہت کم توجہ کی تھی - زیادہ تر اس کی ہمت دینیات اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مصروف رہی اور خاص کر وعظ اور خطابت میں ، جس کی تعلیم مدرسۂ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی ، اس کو عمدہ دستگاہ تھی - طالب علمی ہی کے زمانے میں ، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ، اس کے ہم جماعت لوگ اس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ بلادِ شام میں اس نے مدتوں وعظ کہا ہے - وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں وعظ کہہ رہا تھا اور اہل مجلس نہایت افسردہ دل تھے جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا - میں اس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا کہ ” وَنَحْنُ اَقْرَبُ اَلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد “ کہ ایک راہرو وہاں سے گزرا - اس نے میرا بیان سن کر ایسا پُر جوش نعرہ مارا کہ اور لوگ بھی اس کے ساتھ چیت گئے اور تمام مجلس گرم ہو گئی -

شیخ کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی - عرب ، شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اس کی مادری زبان ہو گئی تھی - وعظ اور بحث و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا اور صرف روزمرہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی بلکہ عربی قصائد فصیح اور بامزہ اس کی کلیات میں موجود ہیں - اس کے سوا بُت خانۂ سومنات کے قصے میں اس نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ژند کی زبان جانتا تھا - سر گورا وسلی لکھتے ہیں کہ ایشیاٹک جرنل کے ایک پرچے مطبوعہ ۱۸۴۳ع میں فرانس کے مشہور محقق ام گارسن ڈی ٹیسی

نے لکھا ہے کہ ''سعدی پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانی زبان یعنی ریختہ میں ، جب کہ وہ سومنات اور گجرات میں آیا تھا شعر کہا ہے۔'' مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اس سے پہلے ہندوستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اس زمانے میں ہوا ہے ، جب کہ ریختہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کی وفات کو تقریباً چار سو برس گزرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ریختہ میں سب سے پہلے اس نے شعر کہا ہے اور یہ تین شعر اس کے مشہور ہیں :

اشعار

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے
گفتا کہ دُر اے باورے اس ملک کی یہ ریت ہے
ہمنا تمھن کو دل دیا ، تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرے میں ان اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے۔ مگر حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس شخص کو سعدی شیرازی سمجھنا ، جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے ، محض غلط ہے۔

سرگورا وسلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ '' شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اس نے اٹھارہ مختلف زبانیں اَن ملکوں کی

لکھی ہیں جہاں جہاں وہ سیاحی کو گیا ہے۔'' اس بیان میں ظاہرا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ایک مدت دراز تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں سفر کرتا رہا ہے اور اکثر جگہ اس نے بہت بہت دیر تک قیام کیا ہے۔ شام ، عراق ، فلسطین ، مصر ، یمن اور ہندوستان میں مدت دراز تک مقام کرنا خود اس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ وہ ان ملکوں کی زبان سے کافی واقفیت رکھتا ہو۔ اس کے سوا اس نے اور بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے ، جن میں سے اکثر کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں کیا ہے۔

شیخ کی سیاحت کا حال :

سرگورا وسلی لکھتے ہیں کہ ''مشرق سیّاحوں میں ابن بطوطہ کے سوا شیخ سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیّاح ہم نے نہیں سنا - اُس نے ایشیائے کوچک ، بربر ، حبش ، مصر ، شام ، فلسطین ، آرمینیا ، عرب ، جملہ ممالکِ ایران ، اکثر ممالک توران ، ہندوستان ، رودبار ، دیلم ، کاشغر اور جیحون سے آگے تک اور بصرہ و بغداد سے ستھین وال[1] تک کی سیر کی تھی -'' صاحبِ موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''شیخ کو چار دفعہ ہندوستان میں آنے کا اتفاق ہوا ہے - ازاں جملہ ایک دفعہ پٹھان اغلمش کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دہلی میں آیا ہے -'' ہمارے نزدیک یہ مضمون محض بے سروپا ہے - اغلمش کوئی بادشاہ ہندوستان میں نہیں ہوا ، شاید سلطان التتمش کے دھوکے میں اغلمش لکھا گیا - بے شک شیخ نے اغلمش کا ذکر گلستان میں ایک جگہ کیا ہے ، جہاں یہ لکھا ہے کہ ''سرہنگ زادۂ بر درِ سرائے اغلمش دیدم'' مگر ہندوستان میں کوئی اغلمش یا سرائے اغلمش نہیں سنی گئی - سعدی اور امیر خسرو کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہوتی ، اگرچہ اکثر تذکرہ نویسوں کو یہ شبہہ ہوا ہے - شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب ''جواہرالاسرار'' میں لکھا ہے

۱- ستھین وال سے مراد شاید سدِّ سکندری ہے ، کیونکہ شیخ نے ایک جگہ اپنے دیوان میں تصریح کی ہے کہ میں سدِّ سکندری تک گیا ہوں -

کہ شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ہندوستان میں آیا ہے، مگر اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ شیخ اور امیر خسرو کے عصر کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا امیر کے ملنے کے لیے آنا خلافِ قیاس ہے۔ امیر خسرو کی ولادت سنہ ۶۵۱ھ میں ہوئی ہے، جب کہ شیخ کی عمر ستر برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب اگر امیر خسرو کی شہرت بفرض محال پچیس برس ہی کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی تھی تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہیے۔ پس یہ کیوں کر خیال میں آتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ، جو شاعری میں یگانۂ وقت اور مقبولِ خاص و عام ہو، ایک پچیس برس کے لڑکے کی شہرت سن کر ایران سے ہندوستان میں آئے۔ البتہ معتبر حوالوں سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے قاآن محمد سلطان ناظم ملتان نے، جس کو خانِ شہید کہتے ہیں، شیخ سے دو بار درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں آئیے۔ اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے اس لیے ان کا کلام بھی شیخ کے ملاحظے کے لیے بھیجا۔ شیخ اس وقت بہت معمّر ہو گیا تھا، اس سبب سے خود نہ آ سکا، لیکن دونوں دفعہ اپنے دو دیوان اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خانِ شہید کو بھیجے اور امیر خسرو کی نسبت یہ لکھا کہ اس جوہرِ قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاہیے۔

شیخ کا ہندوستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ہے۔ صرف بوستان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سومنات سے نکل کر ایک بار مغربی ہندوستان کا دورہ کیا ہے اور وہاں سے بحر ہند اور بحر عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ہے۔

شیخ کے سفر جس قدر گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراسان، ترکستان اور

تاتار تک گیا ہے اور بلخ و کاشغر وغیرہ میں مقیم رہا ہے - جنوب میں سومنات تک آیا اور ایک مدت تک یہاں ٹھہرا اور سومنات سے مغربی ہندوستان میں پھر کر دریا کی راہ سے عرب کو چلا گیا - شمال اور مغرب کی طرف عراقِ عجم ، آذربیجان ، عراقِ عرب ، شام ، فلسطین اور ایشیائے کوچک میں بارہا اس کا گزر ہوا - اصفہان ، تبریز، بصرہ ، کوفہ ، واسط ، بیت المقدس، طرابلس الشرق ، دمشق ، دیار بکر اور اقصائے روم کے شہروں اور قریوں میں مدت دراز تک اس کی آمد و رفت رہی ہے - مغرب کی جانب عرب اور افریقہ میں اس کا بار بار جانا اور وہاں ٹھہرنا معلوم ہوتا ہے - ہندوستان سے مراجعت کے وقت یمن میں جانا ، صنعا میں ایک مدت تک قیام کرنا ، حجاز میں پہنچنا ، اسکندریہ ، مصر اور حبش کے واقعات اس کے کلام میں مذکور ہیں -

شیخ نے دریا میں بھی بارہا سفر کیا ہے - خلیج فارس ، بحر عمان ، بحر ہند ، بحر عرب ، بحر قُلزم اور بحر روم میں اس کے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں - چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ وہ یورپ کے اکثر ملکوں میں پھرا ہے لیکن شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی - اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کیے ہیں اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے - وہ ایک سفر کا حال بوستان میں اس طرح لکھتا ہے کہ بیابانِ فید میں ایک رات نیند کا ایسا غلبہ ہؤا کہ میں چلتے چلتے سرِ راہ پڑ کر سو رہا - پیچھے سے ایک شتر سوار آیا اور اس نے اونٹ کی نکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے کا ارادہ کر لیا ہے جو جرس کی آواز سن کر بھی نہیں اٹھتا ؟ بیابانِ فید جس کا اس حکایت میں ذکر ہے، ایک صحرائے لق و دق ، چھ سو میل لمبا اور چار سو میل چوڑا ہے -

جو حجّاج کوفہ سے مکہ کو جاتے ہیں ان کے رستے کے بیچوں بیچ فید ایک بستی ہے جس کے نام سے یہ صحرا مشہور ہے ۔ فید کوفہ سے تقریباً تین سو پچیس میل ہے اور اسی قدر مسافت پر وہاں سے مکہ معظمہ ہے ۔ اس صحرا میں پانی نہایت کم یاب ہے اور آبادی کہیں نظر نہیں آتی ۔ ایسی راہ سے پیادہ پا حج کو جانا ظاہر کرتا ہے کہ شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں آٹھائی ہیں ۔

کریم خاں زند نے اپنے عہدِ حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطہ بنوایا ہے جو ھفتن کے نام سے مشہور ہے ۔ اس میں سات مجہول الاسم درویشوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں اور احاطے کے دروازے پر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی شبیہیں نصف قد کی لگی ہوئی ہیں ۔ کپتان کلارک نے ، جو بوستان کا ترجمہ انگریزی میں چھاپا ہے ، اس میں شیخ کی اسی تصویر[1] کا فوٹو گراف بھی چھاپا ہے ۔ شیخ کی شبیہ میں ایک کشکول اس کے ہاتھ میں ہے اور ایک تبر اس کے کندھے پر ہے جو کہ اس ملک کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت ہے ۔

شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سرو سامان اور متوکل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے اور بعض موقعوں پر اس کو حالتِ سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں ۔

ساتویں صدی ہجری اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں ، جب کہ صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ فلسطین میں ختم نہ ہوا تھا اور مسلمان اور عیسائیوں کے باہم سخت خصومت اور عداوت ہو

۱- بیتی صاحب ، ایک سیّاح نے اپنے ایران کے سفر نامے میں اس تصویر کا حال مفصل لکھا ہے ۔

رہی تھی ، شیخ پر ایک سخت واقعہ گزرا ہے ، جس کا ذکر گلستان کے دوسرے باب میں کیا ہے - خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار اہلِ دمشق سے ناراض ہو کر اُس نے بیابانِ قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا* تھا اور آدمیوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا - آخر وہاں کے عیسائیوں نے اس کو پکڑ کر قید کر لیا - اُس وقت طرابلس الشرق یعنی مشرقی ٹریپولی میں شہر کے استحکام اور حفاظت کے لیے خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی اسیروں سے (جن کو یورپ کے عیسائی بلگیریا اور ہنگری وغیرہ سے گرفتار کر کے ساتھ لائے تھے) مزدوری کا کام لیا جاتا تھا - شیخ کو بھی یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگا دیا -
شیخ کو بھی یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگا دیا - مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی ، جو شیخ کا واقف کار تھا ، اُس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اس سے پوچھا کہ یہ کیا حالت ہے - شیخ نے کچھ درد انگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قدرت ہے - جو شخص یگانوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے پنجے میں گرفتار ہے - رئیسِ حلب کو اس کے حال پر رحم آیا اور دس دینار دے کر شیخ کو قیدِ فرنگ سے چھڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا - اس کی ایک بیٹی ناکتخدا تھی ، شیخ کا نکاح سو دینار مہر مقرر کر کے اس کے ساتھ کر دیا - چند مدت وہاں گزری ، مگر بیوی کی بد مزاجی اور زبان درازی سے شیخ کا دم ناک میں آ گیا - ایک بار اُس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا کہ کیا آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دس دینار دے کر خریدا ہے ؟ شیخ نے کہا ہاں بے شک میں وہی ہوں - دس دینار دے کر مجھے خریدا اور سو دینار پر آپ کے ہاتھ بیچا -

''نفحات الانس'' میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بیت المقدس اور شام کے شہروں میں سقّائی کی ہے - غالباً یہ وہی زمانہ ہے جس کا ذکر اس حکایت میں کیا گیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایسی ایسی تکلیفیں اور سختیاں اکثر گزری ہیں - وہ گلستان میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے کبھی زمانے کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا ، مگر ایک موقع پر دامنِ استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا - اسی حالت میں غمگین اور تنگ دل کوفے کی جامع مسجد میں پہنچا - وہاں ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے ، اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے -

عالمِ غربت میں کبھی کبھی عسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا ، مگر شیخ ایسے موقعوں پر خود داری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا - ایک سال اسکندریہ میں ، جب کہ شیخ وہاں موجود تھا ، نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت سختی گزرنے لگی - اس زمانے میں وہاں ایک ہیجڑا نہایت دولت مند تھا - غریبوں اور پردیسیوں کو اس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی - کچھ درویش ، جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے ، شیخ کے پاس آئے اور اس ہیجڑے کے ہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی - شیخ نے (باوجود اس کے کہ وہ مدتوں واعظ رہ چکا تھا) ان کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر بھی جائے تو بھی کتّے کا جھوٹا نہیں کھاتا -

شیخ کے وقائعِ سفر میں ، جو کہ اس نے گلستان اور بوستان میں بیان کیے ہیں ، سب سے زیادہ عجیب سومنات کا واقعہ ہے ، جو بوستان کے آٹھویں باب میں مذکور ہے - یعنی شیخ

لکھتے ہیں کہ جب میں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جان دار ایک بے جان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں ؟ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی ۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں ؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی ۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی ، سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا ۔ میں نے مصلحتاً ان کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بد اعتقادی سے نہیں کہی ، میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں ، لیکن چونکہ میں نووارد ہوں اور اسرارِ نہانی سے واقف نہیں ہوں ، اس لیے اس کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں ۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا ، آج رات کو تُو مندر میں رہ ، تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی ۔ میں رات بھر وہاں رہا ، صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا ، جیسے کوئی دعا مانگتا ہے ۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے ۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا ”کیوں اب تو کچھ شبہہ باقی نہیں رہا ؟“ میں ظاہر داری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا ۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے ۔ میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لیے برہمن بن گیا ۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے ، میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا

اور مورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے ادھر آدھر دیکھنا شروع کیا ۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا ، جس کے پیچھے ایک پجاری چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی ۔ معلوم ہوا کہ جب اُس ڈور کو کھینچتا ہے ، فوراً اُس مورت کا ہاتھ اُٹھ جاتا ہے ، اسی کو عام لوگ اس مورت کا کرشمہ سمجھتے ہیں ۔ اُس پجاری نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو گیا ہے ، وہ کھسیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا ، میں بھی اس کے پیچھے دوڑا اور اس خوف سے کہ کہیں مجھ کو پکڑوا کر مروا نہ ڈالے ، اس کو پکڑ کر ایک کنویں میں گرا دیا ۔ اس کے بعد میں فوراً وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندوستان میں ہوتا ہوا یمن کے راستے حجاز میں پہنچا ۔

اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پجاری اور سینکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سینکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے ، وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیوں کر ملا کہ تمام مندر میں اس کے سوا کوئی متنفس باقی نہ رہا ۔ اس کے سوا ایسے سناٹے کے وقت ، جب کہ مندر میں کوئی متنفس موجود نہ تھا ، پردے کے پیچھے ایک پجاری کا ڈور تھام کر بیٹھنا کس غرض سے تھا اور کیوں تھا ؟

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اصل واقعے یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنویں میں دھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو ، مگر اس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعے کے تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے نظم میں پوری پوری نہیں کھچ سکی ۔ اصل یہ ہے کہ جب

کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ وغیرہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہ کر اصل واقعے سے دور پڑ جاتا ہے - پس اگر اُس واقعے سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کو اس کی طرف التفات نہیں ہوتا ، ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے - مثلاً شیخ نے بوستان کے اسی باب میں ایک بادشاہ زادے کی حکایت صرف گیارہ بیت کی لکھی ہے - مطلب یہ ہے کہ گھوڑے سے گر کر اس کی گردن کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ پِھر نہ سکتی تھی ، مگر ایک حکیم کے علاج سے اچھی ہو گئی - کسی قدر صحت کے بعد جب طبیب ملنے کو آیا تو اُس کی طرف کچھ التفات نہ کیا - طبیب وہاں سے دل میں ناخوش ہو کر اٹھ کھڑا ہوا - دوسرے روز ایک دوا بھیجی کہ اس کی دھونی سے بالکل آرام ہو جائے گا - اس سے بادشاہ کو چھینک آئی اور اس کی گردن جیسی چوٹ لگنے پر ہو گئی تھی ویسی ہی پھر ہو گئی - اسی حکایت کو شیخ نے ایک اور چونتیس بیت کی مثنوی میں ، جو بحر ہزج میں ہے ، بیان کیا ہے اور یہ اس کی کلیات میں موجود ہے - ان دونوں مثنویوں میں قصے کے جزئیات مختلف ہیں - مختصر حکایت میں سر زمینِ یونان کا حکیم اور طولانی حکایت میں صرف حکیم لکھا ہے - ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بُوٹی بھیجی تھی اور دوسری جگہ ایک تخم بھیجا تھا - ایک جگہ بادشاہ کا قصہ لکھا ہے اور دوسری جگہ ایک نبرد آزما کا - ایک جگہ لکھا ہے کہ اُسی دوا کی دھونی سے چھینک آئی ، دوسری جگہ چھینک وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں -

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم میں ، بشرطیکہ ناظم کو

حسنِ بیان اور زینتِ الفاظ کا پورا پورا خیال ہو ، قصے کے جزئیات کا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا نہایت دشوار ہے - پس بہ نسبت اس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے ، یہ بہتر ہے کہ اس کے بیان کو اس مقام پر ادائے مطلب میں قاصر سمجھا جائے -

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا :

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعد زنگی کے ابتدائے حکومت میں تحصیلِ علم کے لیے ترکِ وطن اختیار کیا تھا - سعد زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشین ہوا اور سنہ ۶۲۳ھ میں وفات پائی - غالباً شیخ شیراز سے نکل کر سعد زنگی کے زمانے میں وطن نہیں آیا کیونکہ اس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت نہایت ابتر و خراب دیکھی تھی - اتابک اوزبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے حملے اور شہر کا تاخت و تاراج ہونا اپنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا ، مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قتلغ خاں ابوبکر اپنے باپ کی جگہ تختِ سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے فارس کو ، جو دو سو برس سے موردِ آفات و حوادث تھا ، چند روز میں سرسبز و شاداب کر دیا - اگرچہ مورخین نے اس کی تعریف میں بہت مبالغے کیے ہیں ، مگر اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی خوبیوں کے سبب بے انتہا شہرت اور نیک نامی حاصل کی تھی - اطراف و جوانب سے مشائخ و زہاد اس کی شہرت سن کر آتے اور ان کی کمال تعظیم و احترام کیا جاتا تھا - شیراز کی خانقاہیں ، عبادت خانے ، مدرسے اور مسجدیں ، جو ویران ہو گئی تھیں ، اس کے عہد میں آباد کی گئیں اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لیے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں - ایک شفا خانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حاذق طبیب اس پر مامور کیے - اپنی دانش مندی اور حسنِ تدبیر سے ملکِ فارس کو ہمیشہ مغولِ

تاتار کے سیلابِ بلا سے ، جس کی کہیں پناہ نہ تھی ، محفوظ رکھا اور سنہ ۶۲۳ھ[1] سے سنہ ۶۵۸ھ تک سلطنت کی ۔ مدت تک اس کے عہد میں بھی شیخ نے شیراز کا رخ نہیں کیا اور اطراف و جوانب میں سیر و سیاحت کرتا رہا ، مگر جب ابوبکر کا شہرہ دور و نزدیک برابر سننے میں آیا اور وطن کا اشتیاق بھی حد سے زیادہ گزر گیا اور وطن میں قرار واقعی امن و امان قائم ہو گیا ، تب شام سے عراقِ عجم ہوتا ہوا اور اصفہان میں ٹھہرتا ہوا ، جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے مفہوم ہوتا ہے ، شیراز میں پہنچا ۔ شیخ کے کلیات میں ایک قطعہ ملا ہے ، جس سے ثابت ہے کہ اس نے ایک مدت دراز کے بعد ابوبکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف معاودت کی تھی ۔ وہ قطعہ بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔

قطعہ

ندانی کہ من در اقالیمِ غربت
چرا روزگارے بکردم درنگی

ترجمہ : تجھ کو معلوم نہیں کہ میں نے پردیس میں ایک مدت تک کیوں توقف کیا ؟

بروں رفتم از تنگ ترکاں کہ دیدم
جہاں درہم افتادہ چوں موئے زنگی

ترجمہ : میں ترکوں کی چپقلش سے نکل بھاگا کیونکہ ملک حبشی کے بالوں کی طرح ژولیدہ ہو رہا تھا ۔

۱- یہاں دونوں جگہ اصل ایڈیشن میں ”عیسوی“ لکھا ہوا ہے مگر دراصل ”ہجری“ ہے ۔ (اسماعیل پانی پتی)

ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن
چو گرگاں بخوں خوارگی تیز چنگی

ترجمہ : سب آدمی کے بچے تھے لیکن خوں خواری میں بھیڑیوں کی طرح تیز ناخن رکھتے تھے -

دروں مردمے چوں ملک نیک محضر
بروں لشکرے چو ہزبرانِ جنگی

ترجمہ : شہر کے اندر فرشتہ خصلت لوگ تھے اور باہر لشکر کے لوگ جنگی شیروں کے موافق تھے -

چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم
پلنگاں رہا کردہ خوے پلنگی

ترجمہ : جب میں پلٹ کر آیا تو ملک کو آسودہ پایا کہ درندوں نے درندگی کی خصلت چھوڑ دی تھی -

چناں بود در عہد اول کہ دیدم
جہاں پُر ز آشوب و تشویش و تنگی

ترجمہ : اگلے زمانے میں جب کہ ملک کو آشفتہ اور پریشان اور تنگ دیکھا تھا ، ملک کا وہ حال تھا -

چنیں شد در ایّامِ سلطانِ عادل
اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

ترجمہ : اور اب بادشاہِ عادل ابوبکر بن سعد زنگی کے عہد میں یہ حال ہوگیا ہے -

شیراز میں پہنچ کر ظاہرا شیخ نے جامۂ علم و فضیلت آتار کر بالاے طاق رکھ دیا تھا ، کیونکہ اتابک ابوبکر میں باوجود

ان تمام خوبیوں کے ، جو اوپر مذکور ہوئیں ، ایک سخت عیب بھی تھا - وہ ہمیشہ علماء و فضلاء سے بدگمان رہتا اور جاہل فقیروں اور درویشوں کو بہت کچھ دیتا اور ان کے ساتھ کمال ارادت و عقیدت ظاہر کرتا تھا - اسی بدگمانی کے سبب سے چند جلیل القدر آئمہ و علماء کو اس نے جبراً شیراز سے نکلوا دیا تھا - ازاں جملہ امام صدر الدین محمود واعظ اور امام شہاب الدین تودہ پشتی اور مولانا عزالدین ابراهیم قیسی کو کہ اقسامِ علوم میں یگانۂ روزگار تھے ، بہت زجر و تہدید کے ساتھ شیراز سے نکلوا دیا - قاضی عزالدین علوی ، جو کہ سندی سید اور دارالملک کا قاضی القضاۃ تھا ، اس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا - صاحب سعید عمیدالدین اسعد کو ، جو کہ بے مثل ادیب تھا اور سعد زنگی کا نہایت عالی مرتبہ وزیر تھا ، ماخوذ کیا اور مع اس کے بیٹے تاج الدین محمد کے ایک قلعے میں قید کر دیا ، یہاں تک کہ وہ قید ہی میں مرگیا -

اسی سبب سے اہلِ علم اپنا کمالِ علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اور اکثر جہلا ، مشائخ کے لباس میں جلوہ گر ہوتے تھے - تاریخِ وصّاف میں لکھا ہے کہ ایک جاہل آدمی مشیخت مآب بن کر ابوبکر کے دربار میں آیا - اتابک نے اس کی بہت تعظیم و تکریم کی اور جب نمازِ مغرب کا وقت آیا تو اسی کو امام بنایا - شاہ صاحب نے قرأت غلط پڑھی مگر جس قدر انھوں نے قرأت میں غلطیاں کیں ، اسی قدر اتابک کو ان کے ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دے کر انھیں رخصت کیا -

پس شیخ کے لیے علما کے لباس میں رہنا زیادہ خطرناک تھا کیوں کہ بہت سی صفات اس میں ایسی جمع تھیں جن کے سبب سے اس کا مرجعِ خلائق بننا ایک ضروری امر تھا - مثلاً علم و

فضل ، شاعری ، لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی ، فقر و درویشی وغیرہ وغیرہ ، اور اہلِ علم کے مرجعِ خلائق بننے سے ابوبکر ہمیشہ خائف رہتا تھا - اس کے علاوہ بادشاہوں اور عاملوں کے چال چلن پر خوردہ گیری کرنی ، ریاکار فقیروں اور جاہل درویشوں کی قلعی کھولنی اور اسی طرح کے اور بہت سے مفید خیالات اپنی نظم و نثر میں ظاہر کرنے شیخ کا اصلی مقصد تھا ، اور اس غرض کے لیے علمأ اور واعظین کے لباس میں رہنا ہرگز مناسب نہ تھا - ظاہرا وہ اسی سبب سے ، جیسا کہ گلستان کے دیباچے میں مذکور ہے ، ابوبکر کے دربار میں بہت کم جاتا تھا - زیادہ تر سعد بن ابی‌بکر کو ، جس کا نہایت درد ناک مرثیہ شیخ کے کلیات میں موجود ہے ، اس سے ارادت اور عقیدت تھی اور اسی کے نام پر گلستان لکھی گئی ہے -

خودمختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاص کر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی ، مگر شیخ نے ، جس کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم علی‌الاطلاق تھا ، اس فرض کو پورا پورا ادا کیا - سلاطین عہد کے اخلاقی عیب اور اُن کی بدخصلتیں جس طرح اس نے بیان کی ہیں آزاد سلطنتوں میں بھی اس سے زیادہ لکھنی مشکل ہیں ، مگر اس نے ایسے لطیف پیرایوں میں ان پر چوٹیں کی ہیں کہ کسی کو اس پر گرفت کرنے کا موقع نہیں ملا - اکثر سلاطینِ سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر اس نے تعریضیں کی ہیں - کہیں مدحیہ قصائد میں اول مدح و ستائش کی تھوڑی سی چاٹ دے کر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے اور ان کو ظلم اور تعدّی کے برے نتائج سے متنبّہ کیا ہے اور طرح طرح سے رعیت کے حقوق جتائے ہیں اور ان کی بے اعتدالیاں ظاہر کی ہیں - اتابک ابوبکر، جو علما کا مخالف اور مشائخ و زہّاد کا حد

سے زیادہ معتقد تھا ، اس کی تنبیہ کے واسطے گلستان اور بوستان میں اس نے بہت سی حکایتیں لکھی ہیں ۔ مثلاً گلستان کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کے پتّے کھاتا تھا ۔ ایک بادشاہ اس کی زیارت کو گیا اور اس کو شہر میں لے آیا اور ایک عمدہ بستاں سرا میں اُتارا ۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کا آرام اور آسائش پائی ، شاہ صاحب نے خوب رنگ و روغن نکالا ، ہیئت اور صورت بالکل بدل گئی ۔ ایک دن بادشاہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ، درویش کو اچھی حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ جس قدر کہ مجھ کو علما اور زہاد سے محبت ہے ، ایسی اور کسی گروہ سے نہیں ۔ فیلسوف وزیر نے عرض کیا ''حضور شرط دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس لیے علما کو روپیہ دینا چاہیے تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں اور زاہدوں کو کچھ نہ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے زہد پر قائم رہیں ۔''

ایک اور اس سے بھی زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اسی باب میں لکھی ہے جو بالکل اتابک ابوبکر کی حالت کے مناسب ہے ، یعنی ''ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش آئی ، اس نے منّت مانی کہ اگر اس میں کامیابی ہوگی تو اس قدر روپیہ زاہدوں کی نذر کروں گا ۔ جب اس کی مراد پوری ہو گئی تو اپنے عہد کے موافق روپیوں کی تھیلی غلام کو دی کہ زاہدوں کو جا کر دے آئے ۔ غلام بہت ہوشیار اور زیرک تھا ، سارے دن اِدھر اُدھر پھرا اور شام کو تھیلی ہاتھ میں لیے جیسا گیا تھا ویسا ہی چلا آیا اور عرض کیا ''حضور ! ہر چند ڈھونڈا مگر کوئی زاہد نہیں ملا ،

بادشاہ نے کہا ''تو کیا بکتا ہے ! میرے نزدیک اس شہر میں چار سو زاہد سے کم نہ ہوں گے -'' کہا : ''حضور! جو زاہد ہیں وہ تو لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں -'' بادشاہ یہ بات سن کر ہنس پڑا اور فرمایا : ''جتنی کہ مجھ کو درویشوں اور خدا پرستوں سے عقیدت ہے ، اسی قدر اس مردود کو ان سے عداوت ہے ، مگر کہتا سب سچ ہے -'' اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں گلستان اور بوستان میں موجود ہیں - گلستاں کی ایک حکایت میں ، جو کہ جدال سعد کے نام سے مشہور ہے ، اس نے نہایت خوبصورتی سے سلاطینِ عہد اور مشائخِ روزگار کے عیب اور برائیاں بیان کی ہیں - اس حکایت میں اس نے اپنا اور ایک درویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ہے جس میں مخالف کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاہوں کا طرف دار اور مداح قرار دیا ہے - مخالف بار بار درویشوں کی تعریف اور دولت مندوں کی مذمت کرتا ہے اور شیخ ہر دفعہ اس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خوبیاں[1] بیان کرتا ہے - مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قائم کرتا ہے ویسی ہی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ہے اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ہے جو محض درویشوں اور تونگروں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے لکھا گیا ہے -

بادشاہوں کے جور و ظلم اور بیباکی و سفاکی دیکھتے دیکھتے شیخ کے دل میں فی الواقع بنی نوع کی خیر خواہی کا سچا جوش پیدا ہو گیا تھا ، جس کو کوئی خوف اور اندیشہ روک نہ سکتا تھا - ایک بار جب کہ وہ حج کر کے تبریز میں پہنچا اور وہاں کے علما اور صلحا سے ملاقات کی ، تو اس نے یہ ارادہ کیا کہ

---

۱ - خو بیاں کرتا ہے - (اصل متن)

خواجہ شمس الدین جوینی صاحبِ دیوان اور اس کا چھوٹا بھائی خواجہ علاؤالدین جوینی، جو کہ سلطان اباقا خاں[1] کے معتمد وزیر تھے اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے ، ان سے بھی ملاقات کرے ۔ ایک روز ان سے ملنے کا ارادہ کر کے چلا ، راہ میں دیکھا کہ اباقا خاں کی سواری آتی ہے اور اس کے دونوں وزیر اس کے ہمراہ سوار ہیں ۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کترا کر نکل جائے مگر دونوں بھائیوں نے اس کو پہچان لیا اور فوراً گھوڑوں سے اتر کر شیخ کی طرف آئے اور نہایت تعظیم اور ادب سے شیخ کو سلام کیا اور اس کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسے دیے ۔ بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا ، حاضرین سے کہنے لگا کہ شمس الدین نے کبھی ہماری تعظیم بھی اس راہرو آدمی کے برابر نہیں کی ، یہ کون شخص ہے ؟ جب دونوں بھائی شیخ سے مل کر واپس آئے تو اباقا خاں نے خواجہ شمس الدین سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا کہ جس کی تم نے اس قدر تعظیم کی ؟ صاحبِ دیوان نے عرض کیا کہ حضور یہ ہمارا شیخ ہے ۔ حضور نے سنا ہوگا ، شیخ سعدی اسی کا نام ہے اور اس کا کلام ایک عالم میں مشہور و معروف ہے ۔ اباقا خاں نے کہا ''اس سے ہم کو بھی ملواؤ ۔'' چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ کی خدمت میں گئے اور اس کو بادشاہ کے حضور میں لائے ۔ کسی قدر صحبت کے بعد جب شیخ چلنے لگا تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو نصیحت کرو ۔ شیخ نے کہا ''دنیا سے آخرت میں کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی ، مگر نیکی یا بدی ، اب تم کو اختیار ہے جو منظور ہو سو لے جاؤ ۔'' اباقا خاں نے کہا ''اس مضمون کو نظم کر دو تو بہتر ہو ۔'' شیخ نے اسی وقت یہ قطعہ نظم

---

۱ ۔ ہلاکو خاں کا بیٹا جو اس کے بعد بادشاہ ہوا ۔

کر کے پڑھا :

قطعہ

شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد
حلال باد خراجش کہ مُزد چوپانی ست
وگر، نہ راعی خلق است ، زہرمارش باد
کہ ہرچہ میخورد از جزیہ مسلمانی ست

اباقا خاں یہ قطعہ سن کر آب دیدہ ہو گیا اور کئی بار شیخ سے پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں ؟ شیخ ہر بار یہی جواب دیتا تھا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلی بیت آپ کے مناسب حال ہے ، ورنہ دوسری بیت ۔ اباقا خاں شیخ کی آزادانہ پند و موعظت سے نہایت خوش ہوا اور شیخ کو بہت عزت سے رخصت کیا ۔

علی ابن احمد جامع کلیات شیخ اس مقام پر لکھتا ہے کہ ہمارے زمانے کے مشائخ و علما ایسی بیباکانہ نصیحت ایک بقّال یا قصاب کو بھی نہیں کر سکتے اور اسی لیے زمانے کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے ۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ کے یہ کلمات اس وقت اور بھی زیادہ قدر کے لائق ہو جاتے ہیں جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اباقا خاں ہلاکو خاں کا بیٹا اور چنگیز خاں کا پوتا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے ۔ اگرچہ اباقا خاں کو مسلمانوں سے ویسی نفرت نہ تھی ، لیکن بہرحال وہ اسلام سے بیگانہ تھا اور ایک مسلمان شیخ یا واعظ کو اس کے سامنے ایسی جرأت کرنی نہایت دشوار تھی ۔ ایسا کام اسی شخص سے ہو سکتا ہے جس کو نہ جان کا خوف ہو، نہ فائدے کی امید ۔ جیسا کہ شیخ نے گلستاں میں خود لکھا ہے ''نصیحتِ پادشاہاں گفتن کسے را مسلّم است کہ بیمِ سر ندارد و امیدِ زر ۔''

سردار انکیانو، جو بعد زوال خاندانِ اتابکیہ کے سنہ ۶۶۷ ہجری میں سلطان اباقا خاں کے حکم سے صوبۂ فارس کی امارت اور حکومت پر مقرر ہوا تھا، ایک مغل صاحب ہیبت و شان، نہایت رعب داب والا اور اپنے مذہب میں نہایت پختہ تھا اور ہمیشہ علماے اسلام سے مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا اور اس کی ہیبت سے بڑے بڑے اہل منصب لرزتے تھے۔ غالباً اس نے شیخ سے درخواست کی تھی، جس کے موافق شیخ نے نثر میں ایک پند نامہ، جو اُس کے کلیات میں موجود ہے، سردار مذکور کے نام لکھ کر بھیجا ہے۔ اس پندنامے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے بادشاہ، حاکم اور عامل شیخ کے کلام کی نہایت تعظیم کرتے تھے اور اس کی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے تھے۔ سردار انکیانو کی شان میں شیخ نے قصائد بھی لکھے ہیں جو سراسر نصیحت و پند سے بھرے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ بعض قصائد دو تین مدحیہ اشعار کے سوا سراسر پند و موعظت ہی میں ختم کر دیے ہیں۔

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالک ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ہی تھی جیسی فارس اور عراقِ عجم میں۔ چنانچہ ایک دفعہ شیخ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحییٰ کی تربت پر معتکف تھا۔ عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا، مسجد میں آیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا اور کہا ''مجھ کو ایک سخت دشمن کے حملے کا اندیشہ ہے، آپ میرے لیے دعا کریں۔'' شیخ نے کہا ''کمزور رعیت پر رحم کر تاکہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے، جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی اُمید رکھی، اُس نے ایک لغو خیال پکایا اور بیہودہ اُمید باندھی۔''

اگرچہ سلطنتِ عہد کے اعیان و ارکان میں شیخ کے معتقد اور ارادت مند بے شمار تھے لیکن خواجہ شمس الدین صاحبِ دیوان، جس کے نام پر شیخ نے اپنے ایک مجموعۂ نظم کا نام 'صاحبیہ' رکھا ہے اور اس کا بھائی علاؤالدین، جس نے سب سے اول مغولِ تارتار کی فتوحات کے بیان میں 'تاریخِ جہاں کشا' لکھی ہے، شیخ کے ساتھ ایک خاص قسم کا خلوص اور محبت یا عقیدت رکھتے تھے۔ اس مقام پر کچھ مختصر حال ان دونوں بھائیوں کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جُوین، جو کہ خراسان میں ایک سرسبز اور معمور خطّہ تھا، یہ دونوں بھائی وہاں کے سندی سادات میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کے ذریعے سے خانانِ تاتار کے عہد حکومت میں اپنا مرتبہ وزارت تک پہنچایا تھا۔ ہلاکو خاں نے وزیر سیف الدین کی شہادت کے بعد اپنی وزارت بالاستقلال خواجہ شمس الدین جوینی کو عطا کی تھی اور اس کے چھوٹے بھائی علاؤ الدین کو ملک بغداد اور اس کے مضافات پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ہلاکو خاں کے بعد جب اباقا خاں باپ کا جانشین ہوا، اس نے پہلے سے بھی زیادہ شمس الدین کا مرتبہ بڑھا دیا اور سلطنت کی باگ بالکل اس کے قبضے میں دے دی۔ اب اس نے مہماتِ سلطنت کے انصرام، سپاہ و رعیت کی دلجوئی اور تمام ملکی خرابیوں کی اصلاح میں حد سے زیادہ کوشش کی۔ عراق، خراسان، بغداد، شام اور آرمینیہ کے بادشاہ اور حاکم سب اس کے مطیع اور فرماں بردار تھے۔ اس کی فیاضی اور سخاوت کی دھوم دور و نزدیک پہنچی تھی۔ باوجودیکہ اس کا حکم کنارۂ جیحوں سے شام اور ایشیائے کوچک تک نافذ اور جاری تھا، اس پر وہ علما اور فضلا کے ساتھ کمال تواضع اور انکسار سے پیش آتا تھا اور ان کے ساتھ حد سے زیادہ سلوک کرتا تھا۔ کبھی کسی پر اس

نے احسان نہیں جتایا - ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں کی تعظیم اور مدارات ان کے مرتبے کے موافق کرتا تھا اور علاوہ کمالاتِ علمی کے علمِ ادب اور شعر میں بھی اس کو یدِ طولیٰ حاصل تھا - زیادہ تر اسی کی بدولت تاتاریوں میں دین اسلام شائع ہوا اور اسی کے فیضِ صحبت سے اباقا خاں کے بھائی سلطان[۱] احمد نے اپنے گھرانے میں سب سے اول اسلام قبول کیا - آخر ارغون خاں برادرِ سلطان احمد کے ہاتھ سے سنہ ۶۶۳ ہجری میں شہید کیا گیا - شہادت سے چند ساعت پہلے اس نے تھوڑی سی مہلت چاہی تھی ، اس نازک وقت میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام ایک وصیت نامہ تحریر کیا اور ایک خط فضلائے تبریز کو لکھا جو کہ 'تاریخِ وصّاف' میں بجنسہ منقول ہے اور جس سے اس کا کمال استقلال اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے -

اس کے چھوٹے بھائی علاؤ الدین جوینی نے بغداد کی حکومت کے زمانے میں اس اجڑے اور ویران شہر کو ، جو کہ ہلاکو خاں کے ظلم و بیداد سے بالکل پامال ہو گیا تھا ، چند روز میں اپنے عدل اور شفقت اور دلجوئیِ رعایا سے از سر نو معمور کر دیا - نجف اشرف میں ایک نہر کھدوائی جس میں ایک لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہوا اور فرات کا پانی کوفے کی مسجد میں لے گیا - تاریخ میں لکھا ہے کہ جو کام بڑے بڑے خلیفہ اور بادشاہوں سے نہ ہو سکے تھے ، وہ اس فیاض اور دانش مند وزیر کی کوشش

---

۱ - سلطان احمد کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا - تاتاریوں میں اس سے پہلے صرف برکہ خاں ، جو جی خاں کا بیٹا اور چنگیز خاں کا پوتا مسلمان ہوا تھا ، جس کے پاس خوارزم و دشت قبچاق اور روس وغیرہ کی حکومت تھی -

سے ظہور میں آئے - تاریخ جہاں کشا ، جو اس نے تاتاریوں کی فتوحات کے بیان میں لکھی ہے ، وہ ان تمام تاریخوں کا ماخذ ہے جو اس باب میں لکھی گئی ہیں -

الغرض یہ دونوں بھائی ، جو کہ دنیوی جاہ و اقتدار کے علاوہ کمالاتِ علمی میں بھی امتیاز رکھتے تھے اور نیک سیرتی اور حسنِ اخلاق کے لحاظ سے بے مثل تھے ، شیخ سعدی کے ساتھ ان کو حد سے زیادہ خلوص اور اعتقاد تھا ، اور شیخ کو بھی ، جیسا کہ اس کے قصائد و قطعات اور دیگر تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے ، ان دونوں سے انتہا کے درجے کی محبت اور الفت تھی - ظاہرا جب سے شیخ نے سفر ترک کر کے شیراز میں اقامت اختیار کی تھی ، اس کے تمام اخراجات اور اس کی خانقاہ کے مصارف کے متکفّل خواجہ شمس‌الدین اور خواجہ علاؤ الدین تھے - ایک بار خواجہ شمس الدین نے پانچ سو دینار بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دارالسلطنت تبریز سے شیخ کی خدمت میں بھیجے - راہ میں غلام نے شیخ کے معمولی اغماض اور چشم پوشی کے بھروسے پر اس میں سے ڈیڑھ سو دینار نکال لیے اور ساڑھے تین سو شیخ کے حوالے کیے - شیخ نے دیکھا کہ صاحبِ دیوان کے خط میں پانسو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیے ہیں ، اس کی رسید میں یہ قطعہ لکھ بھیجا :

قطعہ

خواجہ تشریفم فرستادی و مال
مالت افزوں باد و خصمت پائمال
ہر بدیناریت سالے عمر باد
تا بمانی سیصد و پنجاہ سال

ترجمہ : تم نے مجھ کو عزت دی اور نقدی بھیجی - تمہاری

دولت زیادہ اور تمھارے دشمن پائمال ہوں - تمھاری عمر فی دینار ایک برس کے حساب سے ہوجیو ! تاکہ تم ساڑھے تین سو برس دنیا میں رہو -

صاحبِ دیوان نے یہ مضمون دریافت کر کے غلام کو بہت زجر و توبیخ کی اور رقم کی بابت تدارکِ مافات کر کے شیخ سے معافی[1] چاہی - اس قسم کے مزاح آمیز اشعار اور بھی کئی موقعوں پر شیخ نے صاحبِ دیوان کو لکھے ہیں - ایک بار اس نے اپنی نظم و نثر کا مجموعہ خواجہ کو حسب الطلب بھیجا تھا -

---

۱ - برمذق بخارائی ، جو ایک زبردست شاعر ہے ، اس کو بھی یہ اتفاق پیش آیا ہے - بادشاہ نے اس کو پانسو تومان انعام میں بھیجے تھے ، مگر اس کو دو سو پہنچے - اس نے یہ قطعہ بادشاہ کو لکھ بھیجا :

قطعہ

شاہِ دشمن گداز ، دوست نواز
آں جہانگیر کو جہاندار است
بش یوز آلتون کرم نمود بمن
لطفِ سلطان بہ بندہ بسیار است
سیصداز جملہ غائب است و کنوں
در براتم دو صد پدیدار است
یا مگر من غلط شنودستم
یاکہ پروانہ چی طلبگار است
یا مگر در عبارتِ ترکی
بش یوز آلتون دویست دینار است

مگر اس قطعے میں ، جیسا کہ ظاہر ہے، شیخ کے قطعے کی شوخی اور لطافت نہیں ہے - بش یوز آلتون کو بش ُیز آلتن پڑھنا چاہیے - یہ ترکی الفاظ ہیں ، جن کا ترجمہ پانسو تومان ہے -

جب ایک مدت تک وہاں سے رسید نہ آئی تو اس کے تقاضے کے لیے یہ قطعہ لکھ بھیجا :

قطعہ

سفینۂ حِکمیّات و نظم و نثرِ لطیف
کہ بارگاہِ ملوک و صدور را شاید

بصدر صاحب صاحبقران فرستادم
مگر بعین عنایت قبول فرماید

سفینہ رفت و ندانم رسید یا نہ رسید
بداں دلیل کہ آیندہ دیر می آید

بہ پارسائے ازیں حال مشورت بردم
مگر ز خاطرِ من بندِ بستہ بکشاید

چہ گفت، گفت ندانی کہ خواجہ دریائے ست
نہ ہر سفینہ ز دریا درست باز آید

ایک بار خواجہ علاؤ الدّین نے جلال الدّین ختنی کو، جو کہ شیراز میں کسی جلیل القدر منصب پر مامور تھا، تبریز سے یہ حکم بھیجا کہ اس قدر دینار شیخ کی خدمت میں بھیج دو ۔ مگر اُس وقت جلال الدّین کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے وہ رقم شیخ کے پاس نہ پہنچی ۔ جب شیخ کو اس حال کی اطلاع ہوئی تو اس نے ہنسی سے خواجہ علاؤ الدّین کو یہ قطعہ لکھ بھیجا :

قطعہ

پیامِ صاحبِ دیوان علائے دولت و دیں
کہ دیں بدولتِ ایّامِ او همی نازد

رسید و پایۂ حرمت فزود سعدی را
بسے نماند کہ سر بر فلک بر افرازد
مثال داد کہ صدرِ ختن جلال الدّین
قبولِ حضرتِ او را تعہّدے سازد
ولیک بر سرِ او خیلِ مرگ تاختہ بود
چناں کہ بر ہمہ[1] ابنائے دہر مے تازد
جلال زندہ نخواہد شدن دریں دنیا
کہ بندگانِ خداوندگار بنوازد
طمع بریدم ازو در سرائے عقبیٰ نیز
کہ از مظالمِ مردم بمن نہ پردازد

ترجمہ : صاحبِ دیوان علاؤ الدین ، جس کے عہدِ دولت پر دین کو ناز ہے ، اس کی تحریر پہنچی اور سعدی کو عزت بخشی - قریب تھا کہ اس کا سر آسمان تک پہنچ جائے - اس میں حکم تھا کہ امیر جلال الدین اس کے فرمان کی تعمیل کر دے ، مگر اس پر لشکرِ اجل کی چڑھائی ہو چکی تھی ، جیسی کہ سب پر ہوا کرتی ہے - اب جلال الدین دنیا میں تو آنے والا ہے نہیں کہ خدا کے بندوں کی خبر لے - میں نے آخرت میں بھی اس سے امید قطع کی ، کیونکہ لوگوں کے استغاثے اس کو میری طرف کاہے کو متوجہ ہونے دیں گے -

خواجہ علاء الدین نے فوراً اس کی تلافی کی اور عذر چاہا -

---

۱ - پہلے ایڈیشن میں 'برسر' لکھا ہے مگر تیسرے ایڈیشن میں خود مولانا نے اس کو 'برہمہ' سے بدل دیا ہے - (اسماعیل پانی پتی)

شیخ کی خانقاہ ، جہاں اب اُس کی قبر ہے ، یہ بھی صاحبِ دیوان کے روپے سے بنی تھی - اس کام کے لیے پچاس ہزار دینار اس نے شیخ کو دیے تھے - شیخ نے ہرچند ان کے لینے سے انکار کیا مگر صاحبِ دیوان نے بہ ہزار منّت و سماجت اس کو راضی کیا اور شیخ کی زندگی ہی میں اس رقم سے ایک عالی شان مدرسہ یا خانقاہ پہاڑ کے نیچے ، جو کہ گوشۂ شمال مغرب میں شہر سے ملا ہوا ہے ، بنوائی گئی اور شیخ آخر عمر تک وہیں عزلت نشیں رہا -

شیخ سے اکثر اہلِ علم حقائق و معارف کے دقائق و غوامض پوچھتے تھے اور وہ ہر ایک کا جواب تحریر یا تقریر میں دیتا تھا - ازاں جملہ علی بن احمد نے ایک قطعہ مولانا سعد الدین کا ، جو کہ علم و فضل کے سوا شاعری میں بھی مشّاق و ماہر تھا ، نقل کیا ہے جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ سالک کی رہنما عقل ہے یا عشق ؟ چونکہ اس قطعے سے اُس زمانے کے علماء کی رائے شیخ کی نسبت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے ، اس لیے وہ قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

قطعہ

سالکِ راہِ خدا ، پادشہِ ملکِ سخن
اے ز الفاظِ تو آفاق پُر از دُرِ یتیم

اخترِ سعدی و عالم ز فروغِ تو منیر
واضع عقلی و گیتی ز نظیرِ تو عقیم

پیشِ اشعارِ تو شعرِ دگراں را چہ محل
سحر بے وقع نماید برِ اعجازِ کلیم

بندہ را از تو سوالے است کہ توجیہِ سوال
نکند مردمِ پاکیزہ سیر جُز بہ کریم

مرد را راہ بحق عقل نماید یا عشق
ایں درِ بستہ تو بکشاے کہ بابے ست عظیم

گرچہ ایں ہر دو بیک شخص نیایند فرود
در دماغ و دلِ بیدار تو ہستند مقیم

پایۂ منصبِ ہر یک ز کرم باز نماے
تا ز الفاظِ خوشت تازہ شود جانِ سقیم

باد آسودہ و فارغ ز بد و نیکِ جہاں
خاطرِ آئنہ کردار تو چوں نفسِ حکیم

شیخ نے اس کے جواب میں ایک طول طویل بحث نثر میں لکھی ہے جو اس کے کلّیات میں موجود ہے -

معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا وہ شیخ کا نہایت ادب اور تعظیم اور اطاعت کرتا تھا - سردار انکیانو کو وہ برابر قصائد اور پند نامہ وغیرہ میں اس طرح خطاب کرتا ہے جیسے بڑے اور بزرگ چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں - اس کے سوا ملک عادل شمس الدین تازی گو ، جو کہ غالباً انکیانو کے بعد شیراز کا حاکم مقرر ہوا تھا ، وہ بھی حد سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزت کرتا تھا - ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں ، جو زمین کے محصول میں زمینداروں سے وصول کی تھیں ، سبزی فروشوں کے ہاتھ جبراً کسی وعدہ پر مہنگے نرخ سے بیچنی شروع کیں اور بہت سے بوجھ شیخ کے بھائی کی دکان پر بھی ، جو کہ خاص بادشاہی ڈیوڑھی کے پاس بقّالی کی دکان کرتا تھا ، بھجوائے - شیخ اس زمانے میں

حضرت ابو عبداللہ[1] ابنِ خفیف کی خانقاہ میں مجاور تھا ، اس کو بھی اس واقعے کی خبر پہنچی ۔ اس نے ملک شمس الدین کو ، جو کہ اس حال سے بے خبر تھا ، ایک قطعہ لکھ بھیجا جس میں اہلِ فوج کی شکایت اور اپنے بھائی کی دکانداری اور بے نوائی کا حال لکھا تھا ۔ شمس الدین نے فوراً اس کا تدارک کیا اور خود شیخ کے پاس آیا اور معافی چاہی اور ہزار درہم پیش کر کے کہا "یہ حقیر رقم آپ کے بھائی کے خرچ کے لیے ہے ، اس کو قبول کیجیے۔" شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی ۔

شیخ کی وفات[2] شیراز میں ، جب کہ اتابکانِ فارس کے خاندان

---

۱ ۔ یہ بزرگوار چوتھی صدی ہجری کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں ، جن کی نسبت خواجہ عبداللہ انصاری نے لکھا ہے کہ حقائق و معارف میں کسی کی تصنیفات ابن خفیف کے برابر نہیں ہیں ۔

۲ ۔ سرگورا وسلی نے اس کی وفات اتابک محمد شاہ ابن مظفر سلغر شاہ بن سعد زنگی کے عہد میں لکھی ہے ، مگر یہ بالکل غلط ہے ۔ اتابک محمد شاہ سنہ ۶۶۱ ہجری میں تخت پر بیٹھا تھا اور آٹھ مہینے سلطنت کر کے مر گیا ۔ پھر اس کا بھائی سلجوق شاہ تخت نشین ہوا اور سنہ ۶۶۲ ہجری[1] میں قتل کیا گیا ۔ پھر سعد زنگی کی بیٹی آبش خاتون کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری ہوا اور سنہ ۶۶۷ ہجری میں اس کو معزول کر کے سلطان اباقا خاں نے سردار انکیانو کو ، جو شیخ کا ممدوح ہے ، حاکم فارس مقرر کیا ۔ اب آگے کوئی متنفس اتابکان فارس کے خاندان کا حکمران نہیں ہوا ۔ پس شیخ کی وفات ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ، خاندان اتابک کے زوال کے چوبیس برس بعد اور اتابک محمد شاہ کے عہد سے تیس برس بعد واقع ہوئی ہے ۔ (بقیہ حاشیے کا حاشیہ نمبر ۱ صفحہ ۶۴ پر)

کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ولایتِ فارس تاتار کی حکومت میں آ گئی تھی ، سنہ ۶۹۱ ہجری میں واقع ہوئی ہے ۔ کسی شاعر نے اس کے مرنے کی تاریخ اس طرح کہی ہے :

دُرِ بحرِ معارف شیخ سعدی
کہ در دریاے معنی بود غوّاص

مہِ شوّال و روزِ جمعہ روحش
بداں درگاہ رفت از روے اخلاص

یکے پرسید سالِ فوت ، گفتم
ز خاصاں بود ازاں تاریخ شد خاص
۶۹۱ھ

شیخ کی عمر کسی نے ایک سو دو برس کی اور کسی نے ایک سو دس برس اور اکثر نے ایک سو بیس برس لکھی ہے ۔ ہمارے نزدیک یہی پچھلا قول صحیح معلوم ہوتا ہے ، کیوں کہ شیخ ، جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے ، جوانی کے زمانے میں شیراز سے باہر گیا ہے اور بغداد میں اس نے مدتوں امام ابن جوزی سے علم تحصیل کیا ہے ۔ امام ابن جوزی کی وفات سنہ ۵۹۷ ہجری میں ہو چکی تھی اور شیخ کی وفات اس سے ۹۴ برس بعد واقع ہوئی ۔ پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو دو برس سمجھی

(صفحہ ۶۳ کے حاشیے کا حاشیہ)

۱ - پہلے ایڈیشن میں سنہ ۶۶۲ عیسوی لکھا ہے مگر یہ کتابت کی غلطی ہے ، اصل سنہ ۶۶۲ ہجری ہے ۔ اسی طرح آگے چل کر سنہ ۶۶۷ھ بھی بجائے ہجری کے عیسوی لکھا ہوا ہے ۔ (اسماعیل پانی پتی)

جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام ابنِ جوزی سے تحصیل علم کر چکا تھا اور اگر ایک سو دس برس کی عمر قرار دی جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ سترہ برس کی عمر میں تحصیلِ علم سے فارغ ہو چکا تھا اور شیراز سے بچپن ہی کے زمانے میں نکل گیا تھا۔ پس جس طرح پہلی بات خلافِ قیاس ہے اسی طرح دوسری بات بھی خلافِ واقعہ ہے۔

سرگورا وسلی نے انگلستان کے ایک سیاح ولیم فرینکلن کے سفرنامے سے، جو کہ سنہ ١٧٨٦ع میں فارس گیا تھا، شیخ کے مدفن کا حال لکھا ہے کہ ''شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک میل جانبِ شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ عمارت اس کی بہت بڑی اور مربع ہے اور قبر سنگین بنی ہوئی ہے جس کا طول چھ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ ہے۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عبارت قدیم نسخ خط میں کندہ ہے جس میں شیخ کا اور اس کی تصنیفات کا حال درج ہے۔ قبر ایک سیاہ رنگ کے چوبی قبر پوش سے، جس پر سنہری کام ہو رہا ہے، ڈھکی رہتی ہے اور اس پر شیخ ہی کا ایک شعر خطِ نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ جب اس قبر پوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھلائی دیتا ہے۔ اکثر اہلِ اسلام، جو اطراف و جوانب سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں، وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اور زائرین کے مطالعے کے لیے ایک نسخہ شیخ کی کلیات کا نہایت خوشخط لکھا ہوا مزار پر رکھا رہتا ہے۔ مقبرے کی دیواروں پر بہت سے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ دوردست مقامات سے وہاں زیارت کو آئے ہیں، یہ اشعار انھوں نے لکھے ہیں۔ شیخ کے مقبرے کی عمارت روز بروز گرتی جاتی ہے اور اگر اس کی جلد خبر نہ لی گئی تو بالکل کھنڈر ہو جائے گی۔ نہایت افسوس کی بات ہے اور زمانے کا عجیب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اس کی

مرمت کرانے کا خیال نہیں آتا - اس مقبرے کے متصل اکثر دین داروں اور بزرگوں کے مزار ہیں ، جنھوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے -'' اس کے بعد سر گورا وسلی صاحب لکھتے ہیں کہ ''سنہ ۱۸۱۱ع کے شروع میں ، جب کہ میں جارج سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے بعنوان سفارت فتح علی شاہ قاچار کے پاس پیغام لے کر طہران کو جاتا تھا ، اس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا - جب تک میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا - مسٹر فرینکلن کے لکھنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جا کر ہوتی ہے - اس کی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہو گئی ہے اور تمام عمارت عنقریب منہدم ہوا چاہتی ہے - باغ اور درخت ، جو زمانۂ سابق میں وہاں تھے ، ان کا اب نام و نشان تک باقی نہیں رہا - میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جائے تو اس مقبرے کی مرمت بخوبی ہو سکتی ہے - اور میرے حسن عقیدت نے ، جو کہ میں شیخ اور اس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا ، مجھ کو آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ صرف کر کے شیخ کے مقبرے کی مرمت کرا دوں - مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا ، جو اس وقت فارس کا گورنر تھا ، اس نے مجھ کو اس ارادے سے باز رکھا اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ میں اپنے روپے سے مزار کی مرمت کرا دوں گا ، آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں - اس نے کہا کہ میں شیخ کے مزار کی مرمت اسی اسلوب اور عمدگی سے کراؤں گا جیسے کریم خاں زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی ، لیکن افسوس ہے کہ اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا -

نہایت تاسّف کا مقام ہے کہ عنقریب وہاں کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطۂ ایران کا فخر ، جو زہد و تقویٰ اور ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا

تھا ، کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے ۔"

سبحان اللہ! کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مذہب ، زمین کے اس کنارے کا رہنے والا جہاں دنیا کی آبادی ختم ہوتی ہے ، باوجود اختلافِ مذہب ، اختلافِ قوم اور اختلافِ ملک کے ایک مسلمان مصنّف کی ایسی قدر کرے کہ عالمِ سفر میں اس کے مقبرے کی مرمت کرانے پر آمادہ ہو اور اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرنے پر موجود ہو ، اور ایک مسلمان بادشاہزادے سے باوجود اتحادِ زبان ، اتحادِ مذہب ، اتحادِ قوم و ملک کے ایسی بے قدری اور بے اعتنائی ظہور میں آئے !! فاعتبروا یآولی الابصار

دوسرا باب

شیخ کی تصنیفات

شیخ کی شاعری کی شہرت اس کی زندگی میں

شیخ کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اُس کی زندگی ہی میں تمام ایران ، ترکستان ، تاتار اور ہندوستان میں اس قدر پھیل گیا تھا کہ اُس زمانے کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اس پر مشکل سے یقین آتا ہے - خود شیخ بھی گلستان کے دیباچے میں کہتا ہے ''ذکرِ جمیلِ سعدی کہ در افواہِ عوام افتادہ ، و صیتِ سُخنش کہ در بسیط زمین رفتہ -'' شیراز اور کاشغر میں کچھ کم سولہ سو میل کا فاصلہ ہے - پہلے اس سے کہ شیخ کاشغر میں پہنچے ، وہاں کے چھوٹے بڑے اس کے کمالات سے واقف تھے -

جس زمانے میں شیخ کاشغر پہنچا ہے ، غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ چنگیز خاں چینی تاتار کو خوارزمیوں سے فتح کر چکا ہے اور سلطان محمد خوارزم شاہ کے ساتھ چند روز کے لیے اس کی صلح ہوگئی ہے - جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وہاں ایک طالب علم مقدمہ' زمخشری[1] ہاتھ میں لیے زبان سے کہہ رہا تھا کہ ''ضرب زید عمرواً'' شیخ اس سے چُہل کی باتیں کرنے لگا اور کہا ''کیوں صاحب ! خوارزم و خطا میں صلح ہو گئی مگر زید اور عمرو کی خصومت بدستور چلی جاتی ہے ؟'' طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا - فرمایا ''خاک پاک شیراز''- اس نے

---

[1] - علامہ جار اللہ زمخشری صاحبِ ''تفسیرِ کشاف'' نے عربی زبان کی نحو میں ایک مختصر متن لکھا ہے ، اُس کا نام مقدمہ' زمخشری ہے -

کہا ''کچھ سعدی کا کلام یاد ہے؟'' شیخ نے بطریقِ مزاح اُسی وقت دو عربی شعر کہہ کر پڑھے۔ اُس نے کسی قدر تامّل کے بعد کہا ''سعدی کا زیادہ تر کلام فارسی ہے، اگر کچھ اُس میں سے یاد ہو تو پڑھیے''۔ آپ نے ویسے ہی دو فارسی شعر پڑھے جن میں سے ایک یہ ہے:

شعر

اے دلِ عشّاق بدامِ تو صید
ما بتو مشغول، تو با عمرو و زید

صبح کو جب شیخ نے کاشغر سے چلنے کا ارادہ کیا، کسی نے اُس طالب علم سے کہہ دیا کہ سعدی یہی ہے۔ وہ بھاگا ہوا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا کہ پہلے سے آپ نے اپنا نام نہ بتایا کہ میں آپ کی خدمت گزاری سے سعادت حاصل کرتا۔ اگر اب بھی چند روز شہر میں چل کر قیام کیجیے تو ہم لوگ خدمت گزاری سے مستفید ہوں۔ اس کے جواب میں آپ نے یہ اشعار پڑھے:

اشعار

بزرگے دیدم اندر کوہسارے
قناعت کردہ از دنیا بغارے

چرا، گفتم بشہر اندر، نیائی؟
کہ بارے بند از دل بر کشائی

بگفت آنجا پری رویانِ نغزند
چو گِل بسیار شد پیلاں بلغزند

اسی طرح ملتان سے، جو کہ شیراز سے چودہ سو میل ہے،

دو بار خان شہید سلطان محمد قاآن نے شیخ کی شہرت سن کر اس کو وطن سے بلایا مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آ سکا ۔

تبریز کے حمام میں جو شیخ اور مشہور شاعر ہمام۱ تبریزی کی نوک جھوک ہوئی ہے ، وہ نہایت مشہور قصّہ ہے ۔ جب تک ہمام نے یہ نہ جانا کہ یہ شخص سعدی ہے ، تب تک اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا ، لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ سعدی شیرازی ہے ، فوراً نہایت شرمندگی سے عذر معذرت کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور جب تک شیخ تبریز میں رہا ، کمال تعظیم اور ادب سے اس کی مہمان داری کی ۔

سرگورا وسلی نے کتاب ''مجالس العشّاق'' سے ایک حکایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکیم نزاریٔ قہستانی (جو کہ خراسان کا ایک مشہور شاعر اور حکیمانہ مزاج کا آدمی تھا اور اسمٰعیلی مذہب رکھتا تھا) شیراز کے حمام میں شیخ سے ایک اجنبی صورت میں ملا ۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص خراسان کا رہنے والا ہے ۔ شیخ نے پوچھا کہ سعدی کو خراسان میں کوئی جانتا ہے ؟ کہا اُس کا کلام وہاں عموماً زبان زدِ خلائق ہے ، اور پھر شیخ کی درخواست سے اس کے چند اشعار پڑھے جن کو سن کر شیخ محظوظ ہوا اور سمجھا کہ یہ شخص شعر کا عمدہ مذاق رکھتا ہے ۔ آخر دونوں پر ایک دوسرے کی حقیقت کھل گئی ۔ شیخ ، نزاری کو اپنے مکان پر لے گیا اور بہت دن اس کو جانے

---

۱ ۔ خواجہ ہمام الدین باوجود نسبتِ باطنی اور کمالاتِ علمی کے تبریز کے امراء میں سے تھا اور شاعری میں تمام معاصرین اُس کو مانتے تھے ۔ محقق طوسی سے تحصیلِ علم کی تھی اور ۷۱۳ ہجری میں وفات پائی ۔

نہ دیا اور بہت خوشی سے خوب دل کھول کر اس کی مہمان داری کی ۔ حکیم نزاری نے وہاں سے رخصت ہوتے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ اگر ہمارا میزبان کبھی خراسان میں آیا تو ہم اس کو دکھائیں گے کہ ہم مہمانوں کی تواضع اور مدارات کس طرح کیا کرتے ہیں ۔ یہ جملہ شیخ کے کان تک بھی پہنچ گیا ۔ اس کو کمال افسوس ہوا اور یہ سمجھا کہ حکیم نے ہماری مہمان داری میں شاید کوئی قصور دیکھا ۔ چند مدت کے بعد حسن اتفاق سے شیخ کا گزر قہستان میں ہوا اور حکیم نزاری سے ملاقات ہوئی ۔ حکیم بہت محبت اور اخلاق سے پیش آیا مگر دعوت میں کچھ زیادہ تکلف نہیں کیا ۔ پہلے روز جو کھانا دسترخوان پر آیا ، وہ محض رسمی اور سیدھا سادہ تھا ، دوسرے وقت ایک بھنے ہوئے تیتر کے سوا اور کچھ نہ تھا ، تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلا ہوا پارچہ اور خشکہ تھا ۔ چلتے وقت حکیم نے شیخ سے معافی چاہی اور کہا کہ جس طرح آپ نے میری ضیافت میں تکلفات کیے تھے ، اس طرح سے مہمان آخر کو بارِ خاطر ہو جاتا ہے ، لیکن ہمارا طریقہ ایسا نہیں ہے ۔ شیخ کو اس جملے کا مطلب ، جو نزاری نے شیراز سے چلتے وقت کہا تھا ، اب معلوم ہوا ۔

اس حکایت سے شیخ کی شہرت اور بلند آوازگی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی تعصبات سے مبرا تھا ۔ فرقۂ اسمٰعیلیہ کے لوگ اس زمانے میں عموماً ملحد اور بے دین سمجھے جاتے تھے اور کوئی فرقہ مسلمانوں کے نزدیک اسمٰعیلیوں سے زیادہ مبغوض اور مردود نہ تھا ۔ پس شیخ کی کمال بے تعصبی تھی کہ اس نے ہمارے عہد کے مولویوں اور واعظوں کے برخلاف ایک غریب اسمٰعیلی کی اپنے وطن میں اس قدر خاطر اور مدارات کی اور خراسان میں خود اس سے جا کر ملا اور اس کا مہمان رہا ۔ الغرض

یہ حال شیخ کی شہرت کا خود اس کے زمانے میں تھا اور اس کے مرنے کے بعد جو عام قبولیت اس کے کلام نے حاصل کی ، اس کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں -

شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں

اکثر جلیل القدر شعرأ نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے ان کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے ''بہارستان'' میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے جس میں فردوسی کو مثنوی کا ، انوری کو قصیدے کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے ، اور وہ قطعہ یہ ہے :

قطعہ

در شعر سہ کس پیمبرانند
ہر چند کہ ''لا نبی بعدی''
ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

نیز مولانا جامی نے '' نفحات الانس '' میں امیر خسرو دہلوی کی کثرتِ تصانیف اور جامعیّت کے ذکر کے بعد شیخ کو باعتبار مقبولیتِ کلام کے امیر پر اس پیرایے میں ترجیح دی ہے کہ امیر نے بھی خضر کے ملاقات کے وقت یہ درخواست کی تھی کہ اپنا آبِ دہن اس کے منہ میں ڈالے ۔ خضر نے فرمایا کہ یہ دولت سعدی کے نصیب کی تھی ۔

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی اور ہمام تبریزی کو اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' میں غزل کا استاد مانا ہے ، لیکن دیگر اصنافِ سخن میں کنایۃً اپنے کو ترجیح دی ہے ، مگر ایک

اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر خود فخر کیا ہے - چنانچہ فرماتے ہیں :

شعر

خسروِ سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت
شیرہ از میخانۂ مستے کہ در شیراز بود

حضرت امیر حسن دہلوی نے بھی ، جن کو اُس زمانے کے اہلِ مذاق سعدیِ ہندوستان کہتے تھے، شیخ کے تتبع پر افتخار کیا ہے - وہ کہتے ہیں :

شعر

حسن گلے ز گلستانِ سعدی آوردہ است
کہ اہلِ معنیِ گلچیں ازیں گلستان اند

خواجہ مجد الدین ہمگر ، جو کہ شیخ کا جلیل القدر معاصر ہے ، اُس سے چار نامی گرامی فاضلوں نے ، جن میں سے دو شخص علاوہ علم و فضل کے ہلاکو خاں کے رکنِ سلطنت بھی تھے، یعنی خواجہ شمس الدین صاحبِ دیوان ، امیر معین الدین پروانہ حاکمِ روم ، ملک افتخار الدین کرمانی اور مُلا نور الدین رصدی نے باتفاقِ ہم دگر ایک قطعہ مرتّب کرکے مجدِ ہمگر کے پاس بھیجا تھا ، جس میں امامی ہروی اور سعدی شیرازی کے کلام پر محاکمے کی درخواست کی گئی تھی - اُس کے جواب میں مجدِ ہمگر نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی :

رباعی

اگرچہ[1] بہ نُطق طوطیِ خوش نفسیم
بر شکّرِ گفتہ ہاے سعدی مگسیم

---

۱ - شیخ نے بھی اس رباعی کو سن کر ایک رباعی لکھی ہے جو اس

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

در شیوۂ شاعری بہ اجماعِ اُمم
ہرگز من و سعدی بہ امامی نہ رسیم

اس رباعی میں اگرچہ ھمگر نے شیخ کو اپنے سے بہتر بتایا ہے مگر امامی کو اپنے اور شیخ دونوں پر ترجیح دی ہے۔

حاجی لطف علی خانِ آذر نے مذکورہ بالا حکایت پر جو کچھ لکھا ہے، وہ ملاحظے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "بعض مدّعیانِ شعر نے مجدالدین ھمگر سے کہ بہ عنایتِ الٰہی پستیِ طبع میں آج اُن کا کوئی نظیر نہیں ہے، سعدی اور امامی کی بابت محاکمہ چاہا تھا۔ انھوں نے جواب میں یہ رباعی تحریر فرمائی۔ میں نے اس رباعی کو پڑھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ہمارے زمانے میں ایسا اشتباہ کسی کو نہیں ہے (جیسا کہ محاکمہ چاہنے والوں کو تھا)۔ اہلِ مذاق جانتے ہیں کہ ھمگر کی تحقیق کیسی پُھسینڈی ہے۔ ہاں انھوں نے اپنی نسبت بالکل صحیح فرمایا ہے کہ میں امامی کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ بے شک امامی کا مرتبہ جناب صاحبِ رباعی سے بہت بالاتر ہے، لیکن کسی طرح اس کو شیخ بزرگوار سے نسبت نہیں ہے، بلکہ تین[1] شخصوں کے سوا اور کسی کی

(حاشیہ صفحہ نمبر ۷۷)

کی کلیات میں موجود ہے، یعنی:

ہر کس کہ ببارگاہِ سامی نرسد
از بختِ سیاہ و بد کلامی نرسد
ھمگر کہ بعمر خود نہ کردہ است نماز
شک نیست کہ ھرگز بہ امامی نرسد

۱ - شاید تین شخصوں سے مراد فردوسی، انوری اور نظامی ہیں۔

مجال نہیں جو شیخ کی مساوات کا دم مار سکے۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جیسا ہمارا زمانہ دانش مندوں پر سخت گزرتا ہے، ایسا زمانہ پہلے سخن وروں پر بھی گزرا ہے یا نہیں؟ جب یہ حکایت میری نظر سے گزری تو مجھ کو صبر آ گیا۔'' حاجی موصوف نے اس مقام پر مجدِ ہمگر کی شان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے:

قطعہ

یکے گفت ''امامی امام ہری را
ز سعدی فزوں یافتہ مجدِ ہمگر

دریں ماجرا چیست رائے تو؟'' گفتم
''ستمگر بود مجدِ ہمگر ستمگر''

ہمارے نزدیک اگر مجدِ ہمگر اُس عصر میں، جس میں سعدی اور امامی گزرے ہیں، نہ ہوتا بلکہ سو پچاس برس بعد پیدا ہوتا تو اُس کو بھی شیخ اور امامی کے رتبے میں ہرگز یہ اشتباہ نہ ہوتا۔ معاصرت نے لوگوں کے حالات پر اکثر ایسے پردے ڈالے ہیں، مگر جس قدر اُن کا زمانہ گزرتا گیا، اُسی قدر وہ پردے مرتفع ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ جو حق بات تھی وہ ظاہر ہوگئی۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک زمانے میں دو اہلِ کمال ہوتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ایک گروہ متعصبین کا کھڑا ہو جاتا ہے، کیونکہ ہر شخص کے کچھ عزیز اور دوست اور اُن دوستوں کے دوست اور اسی طرح کچھ مخالف اور اُن مخالفوں کے دوست اور یگانے ضرور ہوتے ہیں۔ اور اس طرح سے بڑھتے بڑھتے دو بڑے بڑے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن جب وہ طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور ان کے ساتھ کسی کو لاگ یا لگاؤ باقی نہیں رہتا تو جو ٹھیک بات ہوتی ہے،

وہ بغیر بحث و حجت کے خود بخود دلوں پر نقش ہو جاتی ہے - شیخ اور اسامی کے عہد میں یہ کس کو معلوم تھا کہ عنقریب ایک کا کلام اطرافِ عالم میں پھیل جائے گا اور دوسرے کا نام صرف کتابوں میں لکھا رہ جائے گا -

کلامِ شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں اکثر یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ مشائخِ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے - ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے ہیں - آن بزرگ نے پوچھا کہ ''یہ کیا ماجرا ہے ؟'' کہا ''سعدی شیرازی نے ایک بیت کہی ہے جو جنابِ الٰہی میں مقبول ہوئی ، یہ اس بیت کا صلہ ہے ، اور وہ بیت یہ ہے :

بیت

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفترے ست معرفتِ کردگار

جب وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے تو رات ہی کو شیخ کے عزلت خانے پر یہ مژدہ سنانے کے لیے گئے - وہاں جا کر شیخ کو دیکھا کہ چراغ روشن کیے ہوئے جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں -

شاید اس حکایت کا مضمون بادی النظر میں مستبعد معلوم ہو ، لیکن ہم کو اس میں کوئی بات عقل یا نیچر کے خلاف نہیں معلوم ہوتی - خوابوں کا سچا ہونا اور ان میں معمولی باتوں کا غیرمعمولی طور پر نظر آنا ایک ایسا مسلّم امر ہے کہ آج کل کے فلسفی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے - اس کے علاوہ ہم اس حکایت سے ہر حال میں یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ شیخ کے کلام

کی مقبولیت اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ معمولی پیرائے اس کے بیان کے لیے کافی نہ سمجھے جاتے تھے۔

اس حکایت کو اور زیادہ چمکانے کے لیے شیخ ابوالفیض فیضی کے مخالفوں نے ایک اور دلچسپ مضمون تراشا ہے؛ یعنی یہ کہ فیضی نے ''نلدمن'' کی توحید لکھتے وقت جب یہ شعر کہا:

شعر

در ہر بُنِ مُو کہ می نہی گوش
فوّارۂ فیضِ اوست در جوش

تو اس نے بھی ویسے ہی صلے کی توقع میں، جو شیخ سعدی کو ملا تھا، آسمان کی طرف منہ کیا۔ اتفاقاً ایک چیل نے اوپر سے پیخال کی جو فیضی کے منہ پر آ کر پڑی۔ وہ بہت جھنجھلایا اور کہا ''شعر فہمیِ عالمِ بالا معلوم شد''۔ ظاہرا یہ مضمون عبدالقادر بداؤنی کا، جو کہ شیخ مبارک کے خاندان کا سخت دشمن ہے، گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر[۱] اخیر کا فقرہ ایسا گرم ہے کہ مولوی صاحب کے چہرے پر ہرگز نہیں کھُلتا۔

چمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ''سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی روما کے مشہور شاعر ہوریس کے کلام سے بہت ملتی ہے۔ چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی، اس لیے ظنِ غالب ہے کہ وہ ہوریس کے کلام سے مستفید ہوا ہو گا۔'' ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے اور واقعے میں شیخ کو لاطینی آتی تھی یا نہیں؟ ظاہرا یہ ویسا ہی قیاس ہے جیسا کہ دلی کی جامع مسجد اور آگرہ کے روضۂ تاج گنج کی نسبت کہا

۱۔ اس پیرے کا یہ آخری فقرہ پہلے ایڈیشن میں ہے مگر بعد کے کسی ایڈیشن میں نہیں ہے۔ (اسماعیل پانی پتی)

جاتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں اٹلی کے کاریگروں نے بنائی ہیں ۔ بات یہ ہے کہ جو قوم نہایت پستی کی حالت میں ہوتی ہے ، اگرچہ وہ کسی زمانے میں کتنی ہی ترقی کر چکی ہو ، جس طرح اُس قوم کی موجودہ نسلیں ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں حقیر و ذلیل اور ہیچ و پوچ معلوم ہوتی ہیں ، اسی طرح اُن کے اسلاف کی عظمت اور برتری کا بھی بہت کم یقین آتا ہے ۔ اور اگر ان کی کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا تو اس کو مجبوراً کسی اور کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے ۔

سر ولیم جونس ، جو کہ مشرقی زبانوں کا نہایت مشہور عالم ہے ، اُس نے جو شیخ اور اس کے کلام کی بابت لکھا ہے ، وہ سر گورا وسلی نے نقل کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ ''سعدی ۔ تیرھویں صدی میں ، جب کہ اتابکانِ فارس وہاں کے اہلِ کمال کو تقویت دے رہے تھے ، اپنے جوہر دکھانے شروع کیے تھے ۔ حالانکہ اُس کی تقریباً تمام زندگی سفر میں گزری تھی ، باوجود اس کے کسی ایسے شخص نے بھی ، جس کو عمر بھر اطمینان اور فرصت حاصل رہی ہو ، اپنی عقل اور محنت کا نتیجہ شیخ سے بہتر نہیں چھوڑا ۔''

انگلستان کے بعض مصنّفوں نے اس کو ایسٹرن شیکسپئر یعنی مشرقی شیکسپئر کہا ہے ۔ اگرچہ یہ تشبیہ اُن مشرقی شاعروں کی نظر میں ، جو شیکسپئر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں ، کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی ، لیکن جب کہ یہ بات مسلّم ہے کہ انگریز شیکسپئر کو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں ، تو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ سعدی کو مشرق کا شیکسپئر کہتے ہیں ، اُنھوں نے کس درجے کا شاعر تسلیم کیا ہے ۔

شیکسپئر کی شاعری اگرچہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جا سکتی

ہے - دونوں کے کلام میں عموماً یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادات کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نیچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں - دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیان ہمیشہ سادہ ، صاف ، اور دل نشیں ہوتا ہے - اس کے سوا دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت و پند پر رکھی ہے - صرف فرق اس قدر ہے کہ شیخ کھُلم کھُلا نصیحت کرتا ہے اور شیکسپیئر کے پلے (یعنی ناٹک) سن کر کسی شخص کو یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ یہ میرے ہم جنسوں کے عیب بیان ہو رہے ہیں یا کسی کو نصیحت کی جاتی ہے - مگر اس کا بیان اندر ہی اندر اپنا کام کرتا ہے ، بلکہ یہ گُپتی منتر صریح نصیحت و پند سے زیادہ کارگر ہوتا ہے - نیز دونوں کا کلام مقبول اور دل نشیں ہونے میں ایک دوسرے سے نہایت مشابہت رکھتا ہے - جس طرح شیکسپیئر کے صدہا اقوال انگریزی میں ضرب المثل ہو گئے ہیں ، اسی طرح شیخ کی گلستان اور بوستان کے صدہا فقرے اور شعر اور مصرعے فارسی اور اُردو میں ضرب المثل ہیں ، اور اس سے دونوں کے کلام کی کمال خوبی اور حسن ، اور یہ بات کہ اُنھوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر تسلط کیا ہے اور اُن کا کلام کس قدر انسان کی حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق واقع ہوا ہے ، ثابت ہوتی ہے - اگرچہ اس کا زیادہ تر سبب یہ بھی ہے کہ ایشیا میں جس قدر گلستان اور بوستان کی تعلیم و تعلّم کا چرچا ہے ، ایسا اور کسی کتاب کا نہیں ہے - اور اسی طرح یورپ میں جس قدر شیکسپیئر کا کلام دائر و سائر ہے ، ایسا اور کسی شاعر کا کلام نہیں - پس ضرور ہے کہ دونوں کے اقوال سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوں - لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی کلام فی نفسہ مقبول اور دل نشیں

ہونے کے قابل نہ ہو ، کسی طرح ممکن نہیں کہ اس طرح تمام
ملک میں مشہور اور متداول ہوسکے -

کلیاتِ شیخ

شیخ کا تمام کلام نظم ، نثر ، فارسی اور عربی جو اس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی ابن احمد ابن ابی بکر نے شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے ، حسبِ تفصیلِ ذیل ہے :

۱ - نثر میں چند مختصر رسالے (جن میں سلوک اور تصوّف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکایتیں اور ملوک و حکام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) - ۲ - گلستاں - ۳ - بوستاں - ۴ - پند نامہ (جس کو عرف عام میں 'کریما' کہتے ہیں) - ۵ - قصائدِ فارسی (جن میں مراثیے ، ملمّعات ، مثلّثات اور ترجیعات بھی شامل ہیں) - ۶ - قصائدِ عربیہ - ۷ - غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بہ طیّبات - ۸ - دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع - ۹ - تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم - ۱۰ - غزلیاتِ قدیم جو غالباً عنفوانِ شباب کی لکھی ہوئی ہیں - ۱۱- مجموعہ موسوم بہ صاحبیّہ جس میں شیخ نے قطعات ، مثنویات ، رباعیات اور مفردات کو خواجہ شمس الدّین صاحبِ دیوان کی فرمائش سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے - ۱۲- مطائبات و ہزلیات -

ان تمام کتابوں اور رسالوں میں سے مثنوی 'پند نامہ' یعنی ''کریما'' کو بعض اہلِ مذاق شیخ کا کلام نہیں سمجھتے کیونکہ اول تو کلّیات کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ مثنوی نہیں دیکھی گئی ، دوسرے شیخ کے عام کلام میں جو پختگی اور جزالت

یا دلفریبی اور جادو پایا جاتا ہے ، اس سے یہ مثنوی معرّا ہے ، مگر ہمارے نزدیک اس مثنوی کو شیخ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی استبعاد اور تردد کی بات نہیں ہے - یہ سچ ہے کہ وہ بوستاں اور شیخ کی عام نظم کے مقابلے میں نہایت کم وزن معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا حال بالکل اس شعر کا مصداق ہے :

شعر

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینیم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینیم

ایک ہی شاعر کا ایک کلام معجزہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہذیان اور یہی وہ خاصیت ہے جو بشر کے کلام کو خدا کے کلام سے جدا کرتی ہے - کَمَا قَالَ اللہُ تعالیٰ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافاً کَثِیْراً - کلیات کے بعض قدیم نسخوں میں اس مثنوی کا نہ پایا جانا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ شیخ کا کلام نہیں ہے - ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اس نے اس کو بھی کلّیات میں داخل کر دیا ہو اور اس سبب سے کلّیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہو - بہرحال ہم جس طرح اس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں دیکھتے ، اسی طرح اس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے -

اب ہم شیخ کی بعض تصنیفات پر ، جو زیادہ مشہور ہیں یا زیادہ لحاظ کے قابل ہیں ، متوجہ ہوتے ہیں - جہاں تک ہماری محدود واقفیت اور ناچیز رائے مساعدت کرے گی ، ہم ان کی حقیقت

ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے ۔ ناظرین با تمکین سے یہ درخواست ہے کہ اگر کہیں ہماری رائے کی غلطی ظاہر ہو تو اس کو متعصبانہ افراط و تفریط پر محمول نہ فرمائیں بلکہ اس کو ایک مقتضائے بشریت سمجھ کر اسی قدر مواخذے کے قابل ٹھہرائیں جس قدر کہ ایک غلط مگر سچی رائے پر مواخذہ ہو سکتا ہے ۔

گلستاں اور بوستاں

اگرچہ ہر تصنیف و تالیف کی ماہیت اور ان کے عیب اور خوبیاں بیان کرنی عموماً مشکل ہیں لیکن جو کلام سب کے نزدیک مقبول ہو اور جس پر کسی نے خردہ‌گیری نہ کی ہو ، اُس پر ریویو لکھنا اور اُس کی خوبی یا عیب بیان کرنا حد سے زیادہ مشکل ہے - جس طرح بدیہیّات پر استدلال کرنا نہایت دشوار ہے ، اسی طرح ایسی مقبول اور مسلّم کتابوں کے محاسن بیان کرنے مشکل ہیں ، اور اسی طرح ان پر نکتہ چینی کرنی اَور بھی زیادہ مشکل ہے - ہم پہلا آسان کام کسی قدر اپنے ذمّے لیتے ہیں اور دوسرے مشکل کام کو اپنے سے زیادہ دقیقہ شناس اور باریک بیں لوگوں پر چھوڑتے ہیں -

ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لبِ لباب سمجھنا چاہیے - ظاہرا فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوعِ خاص و عام نہیں ہوئی - ایران ، ترکستان ، تاتار ، افغانستان اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے - بچپن میں ان کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور بڑھاپے تک ان کے مطالعے کا شوق باقی رہتا ہے - لاکھوں اُستادوں نے انھیں پڑھایا اور کروڑوں شاگردوں نے اُن کو پڑھا - ان کے بے شمار نسخے خوش نویسوں کے قلم سے لکھے گئے اور بے انتہا ایڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے - مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے ،

مشائخ اور علما نے ان کی عزت کی ، بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دستور العمل بنایا ، منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت و بلاغت کے آگے سر جھکایا اور ان کے تتبّع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا ۔ ان کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے ، اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے ۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسنِ قبول ، فصاحت ، بلاغت ، تہذیبِ اخلاق ، پند و نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے ، بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ ''احدھما افضل من الآخر'' لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستاں کو بوستان پر ترجیح دی جائے تو کچھ بے جا نہیں ہے ۔

فارسی نظم میں بوستاں کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستاں سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں ، بلکہ 'مثنوی معنوی' اور 'شاہنامہ' نے شاید اس سے بھی بڑھ کر قبولیت حاصل کی ہے ، لیکن فارسی نثر میں ظاہرا کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستاں کے برابر مقبول ہوئی ہو ۔ سر گورا وسلی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ''سعدی کی گلستاں کا ترجمہ ، جو کہ مشہور فاضل جنٹیس نے لاطینی میں کیا تھا ، اس نے مدتوں یورپ کے اہل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے ۔

تذکرۂ 'مجمع الفصحا' میں ، جو کہ ابھی ایران میں تالیف ہوا ہے ، لکھا ہے کہ ''فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں ، ایسی اور کوئی کتاب نہیں ہوئی ؛ شاہنامہ ، مثنوی معنوی ، گلستاں اور دیوان حافظ''۔

ہندوستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں جیسی ایران میں ، مگر سب کی شہرت اور قبولیت کے وجوہ مختلف ہیں ۔ اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بےساختگی میں چاروں کتابیں کم و بیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی ، لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کے ساتھ کوئی دلکش اور دلفریب چیز نہ ہو ، کیونکہ نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں ، جو تکلف اور تصنع سے بالکل پاک ہیں ، ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ۔

ہماری رائے میں گلستاں کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اس سبب سے مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ زمانے کے مذاق اور طبائع کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی تھیں ۔ سب سے اول 'شاہنامہ' پر غور کرو ، قطع نظر اس کے کہ قدیم زمانے کے حالات اور گزشتہ قوموں اور بادشاہوں کے محاربات انسان کو ہمیشہ بالطبع مرغوب ہوتے ہیں ۔ جس زمانے میں کہ 'شاہنامہ' لکھا گیا ، اُس وقت وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کو فتوحات اور لشکر کشی و کشور کشائی کا شوق حد سے بڑھا ہوا تھا اور شجاعت و بہادری کے مضمون ان کو دل سے پسند آتے تھے ۔ پس ایک رزمیہ نظم کا ، جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ہیں ایسے وقت میں لکھا جانا ان کی حالت کے نہایت مناسب تھا ۔ یہی سبب تھا کہ 'شاہنامہ' ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی صدہا داستانیں کم و بیش لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھیں اور آخر کو اُس کا یہاں تک رواج ہو گیا تھا کہ بادشاہوں کے ہاں 'شاہنامہ' خواں نوکر رکھے جاتے تھے اور قہوہ خانوں میں جابجا گرمیِ صحبت کے لیے 'شاہنامہ' پڑھا جاتا تھا ۔ اس کے سوا ہزاروں عجیب و غریب

قصے ، جیسے سیمرغ کا زال کو پرورش کرنا ، طہمورث دیو بند کا دیووں کو قید کرنا ، جامِ جمشید کے کرشمے ، رستم کا اپنے زور سے تنگ آ کر اس کو خدا کے پاس امانت رکھوانا اور پھر سہراب کی لڑائی میں واپس لے لینا ، اس کا سیکڑوں دیووں کو مارنا اور مغلوب کرنا ، اس کے رخش کا شیروں کو ہلاک کرنا ، دژِ بہمن کا طلسم ٹوٹنا اور اسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل 'قصۂ امیر حمزہ' اور 'بوستانِ خیال' کے اس میں درج تھے ، جو تمام دنیا کے آدمیوں کو عموماً اور ایشیا والوں کو خصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے ہیں - ان باتوں نے 'شاہنامہ' کو اور بھی زیادہ مقبول اور عام پسند کر دیا تھا -

مولانا روم کی مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب کہ ہمارے لٹریچر میں تصوف اور معرفت کا تسلط روز بروز بڑھتا جاتا تھا - شیخ محی الدین ابن العربی ، شیخ صدر الدین قونوی ، شیخ شہاب الدین سہروردی ، شیخ علاؤ الدولہ سمنانی وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوف کی روح پھونک رہی تھیں - شعر میں حقیقت اور معرفت کے مضامین تغزّل کی نسبت زیادہ دل لبھانے لگے تھے - شیخ اکبر اور ابن فارض کے دیوانوں کے سامنے متنبّی اور ابو تمام کی تشبیہیں بے مزہ معلوم ہونے لگی تھیں - 'حدیقہ' اور 'منطق الطیر' نے رودکی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرا دیا تھا - ایسے وقت میں 'مثنویِ معنوی' کا ، جو کہ سراسر تصوف اور حقائق سے بھری ہوئی ہے ، مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا جیسے غزنویہ اور سلاجقہ کے عہد میں 'شاہنامہ' کا اور صفویہ کے عہد میں 'حملۂ حیدری' کا - اس کے سوا مثنوی میں بھی صدہا عجیب و غریب قصے اور فوق العادۃ نقلیں اور تمثیلیں ، جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں ، درج تھیں اور ان میں شریعت اور

طریقت کے اسرار بیان کیے گئے تھے - پس مثنوی میں شعر اور تصوف کے علاوہ قصے کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی - یہی باعث ہے کہ مولانا روم کے حق میں ''نیست پیغمبر و لے دارد کتاب'' اور 'مثنوی' کے حق میں ''ہست قرآں در زبانِ پہلوی'' کہا گیا ہے -

خواجہ حافظ کے دیوان میں عشق و جوانی اور رندی اور شاہد بازی کے مضامین کے سوا ، جو کہ دنیا میں ہمیشہ مرغوب رہے ہیں اور انسان کے دل کو بزور اپنی طرف کھینچتے ہیں ، اور کوئی مضمون ہی نہ تھا ، اور اس خیال نے کہ اس میں عشقِ حقیقی کی واردات اور کیفیات عشقِ مجازی کے پیرائے ہیں ادا کی گئی ہیں ، اس کو اور بھی زیادہ دلچسپ اور دل رُبا کر دیا تھا - پس ان تینوں کتابوں کا اس قدر مقبول ہونا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہ تھی -

گلستاں میں ان وجوہ میں سے کوئی وجہ نہ تھی - نہ اس میں رزم تھی ، نہ عجیب و غریب افسانے تھے ، نہ فوق العادۃ قصے ، نہ حقائق و معارف ، نہ شریعت کے اسرار ، نہ طریقت کے نکات ، نہ غزلِ عاشقانہ ، نہ قولِ عارفانہ ، بلکہ اس کی بنیاد محض اخلاق پند و موعظت پر رکھی گئی تھی ، جس سے زیادہ کوئی پھیکا اور بے نمک مضمون خاص کر فارسی لٹریچر میں نہیں پایا جاتا - پند و موعظت جب تک قصے یا ناٹک کے پیرائے میں نہ ادا کی جائے ، اکثر مخاطب کی وحشت اور تنفّر کا باعث ہوتی ہے - کیوں کہ انسان کی طبیعت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ وہ کھلی نصیحتوں سے متنفّر اور چھپی نصیحتوں سے متاثر ہوتا ہے - پس گلستاں کا اس قدر مقبول ہونا سوا اس کے کہ اس کی فصاحت و بلاغت اور

حسنِ بیان اور لطفِ ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور لاجواب تسلیم کیا جائے ، اور کسی وجہ پر محمول نہیں ہو سکتا۔

گلستاں کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر زبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے ، ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا ۔ خود شیخ ہی کے زمانے میں گلستاں کے اکثر قطعات و ابیات اس قدر مقبول اور زبانوں پر جاری ہو گئے تھے کہ اس زمانے کے فضلا اور ادبا اس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کر کے اپنا زورِ طبع اور قدرتِ نظمِ عربی دکھاتے تھے ۔ چنانچہ ادیبِ نام دار فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی نے بھی ، جو کہ شیخ کے اخیر زمانے میں تھا ، اپنی مشہور تاریخ 'وصّاف' میں گلستاں کے دو قطعوں کا ترجمہ عربی میں نظم کیا ہے جو کہ مع اصل قطعات کے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :

قطعۂ سعدی

گِلے خوشبوے در حمّام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم

بدو گفتم کہ مُشکی یا عبیری
کہ از بوے دلآویزِ تو مستم

بگفتا من گِلے ناچیز بودم
ولیکن مُدتے با گُل نشستم

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ترجمۂ عربیّہ

اذا ہو فی الحمّام طین مطیّب
توصّل من ایدی کریم الیٰ یدی

فقلت لہ ہل انت مسک و عنبر؟
فانّی من ریّاک سکران معتد

اجاب بانّی کنت طیناً مذللاً
فجالست للورد الجنی بمعھد

فاثّر فی خلقی کمال مجالسی
و الّا انا الترب الذی کنت فی ید

قطعۂ سعدی

گر خردمند ز اجلاف جفائے بیند
تا دلِ خویش نیازارد و درہم نشود
سنگِ بد گوہر اگر کاسۂ زریں بشکست
قیمتِ سنگ نیفزاید و زر کم نشود

ترجمۂ عربیّہ

ان نال ندّ من الاندال منقصۃ
حاشی لہ ان یذیب النّفس بالضجر
فالتّبر من حجر اذ صار منکسراً
فالتّبر تبر و مایزداد فی الحجر

پھر ایک مدت کے بعد گلستاں کا ترجمہ ، جیسا کہ مشہور

ہے ، عربی زبان میں ہوا جو کئی صدیوں تک عرب ، شام ، روم اور مصر میں متداول رہا اور حال میں مصر کے ایک ادیب نے ، جس کا نام جبریل ہے ، اس کا ایک اور نہایت فصیح عربی ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں چھپوایا ہے۔ اس کے سوا استنبول کی ترکی میں بھی اس کے متعدد ترجمے سنے گئے ہیں جن کا مفصّل حال معلوم نہیں ہے - یورپ میں گلستاں اور بوستاں کے جس قدر ترجمے ہوئے ہیں ، ان کی ٹھیک تعداد معلوم ہونی مشکل ہے ، مگر انگلش سائیکلو پیڈیا میں کسی قدر ترجموں اور ایڈیشنوں کا ذکر کیا گیا ہے جو سنہ ۱۸۵۲ع تک چھپے اور شائع ہوئے ۔ اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

گلستاں کے ترجمے بوستاں کی نسبت بہت زیادہ ہوئے ہیں ۔ سب سے پہلے جنٹی‌یس نے اصل گلستاں مع لاطینی ترجمہ اور کسی قدر حواشی کے ایمسٹرڈم میں چھپوائی ، پھر ڈورائر نے ، جو کہ فرانس کی طرف سے اسکندریہ میں کونسل تھا ، فرنچ میں اس کا ترجمہ کیا جو سنہ ۱۶۳۴ع میں بمقام پیرس چھپا ۔ اس کے بعد اصل کتاب سے گاڈین نے سنہ ۱۷۸۹ع میں اور سیمالیٹ نے سنہ ۱۸۳۴ع میں ترجمہ کیا ۔ یہ دونوں ترجمے بھی فرنچ میں ہوئے تھے ۔ جرمن زبان میں اولی ایریس کا ترجمہ زیادہ مشہور ہے ۔ وہ اس کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس ترجمے میں ایران کے ایک فاضل سے مدد لی گئی ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میرے ترجمے سے پہلے ڈورائر کے فرنچ ترجمے سے ایک اور ترجمہ جرمن میں ہو چکا تھا ۔ اولی ایریس کا ترجمہ نہایت ذی وقعت ہے اور اس میں جو تصویریں چھاپی گئی ہیں وہ بھی بہت عمدہ ہیں ۔ یہ ترجمہ اول ۱۶۵۴ع میں بمقام سلیزوگ چھپا تھا اور اسی سال جرمن سے ڈچ زبان میں ترجمہ ہو کر ایمسٹرڈم میں چھپا ۔ اولی ایریس نے بوستاں کا بھی ترجمہ جرمن میں کیا ہے ۔

حال میں گلستاں کا ایک اور ترجمہ ایچ گراف نے جرمن میں کیا ہے جو سنہ ۱۸۴۶ع میں بمقام لیپزگ چھپا ہے - اسی مترجم نے بوستاں کا بھی ترجمہ کیا ہے جس کا نام لسٹ گارٹین ہے جو سنہ ۱۸۵۰ع میں دو جلدوں میں چھپا ہے - انگریزی میں گلستاں کا ترجمہ ایک تو گلیڈون نے کیا ہے جو بمقام لندن سنہ ۱۸۰۸ع میں چھپا - دوسرا ترجمہ راس صاحب کا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے کیا گیا تھا - ایک اور ترجمہ ایسٹوک نے انگریزی میں کیا ہے، نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں، جو سنہ ۱۸۵۲ع میں بمقام ہرٹ فورڈ چھپا تھا - یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے -

سعدی کے کلّیات فارسی و عربی چھوٹی تقطیع کے کاغذ پر ہیرنگٹن نے سنہ ۱۷۹۱ع میں چھپوائے تھے اور گلیڈون نے صرف گلستاں سنہ ۱۸۰۶ع میں چھپوائی جو دوبارہ سنہ ۱۸۰۹ع میں بمقام لندن مطبوع ہوئی - پھر سنہ ۱۸۰۷ع میں جس ڈیمولین نے گلستاں مع اپنے ترجمے کے کلکتے میں چھپوائی جو کہ اس وقت سے اب تک کئی بار پتھر پر چھپ چکی ہے - پروفیسر فاکز[1] نے فارسی خواں طلبا کے لیے بوستاں کا نہایت عمدہ انتخاب کر کے چھپوایا ہے، جس میں تقریباً تہائی کتاب داخل ہے اور بعض حکایات کے ترجمے حواشی سمیت ایشیاٹک جرنل میں مع متن کے چھاپے گئے ہیں - ڈاکٹر اے اسپرنگر نے سنہ ۱۸۵۱ع میں بمقام کلکتہ گلستاں مع اعراب اور علامات وقف کے چھپوائی تھی اور ایسٹوک نے بمقام ہرٹ فورڈ سنہ ۱۸۵۰ع میں اس کو کئی قلمی نسخوں سے صحیح کر کے مع فرہنگ کے شائع کیا -

مذکورۂ بالا ترجموں اور ایڈیشنوں کے سوا، جن کا ذکر انگلش سائیکلو پیڈیا میں کیا گیا ہے، اور بھی بہت سے ترجمے اور

---

۱ - بعد کے ایڈیشنوں میں یہ نام 'فاکر' لکھا ہوا ہے - (اسماعیل پانی پتی)

ایڈیشن خصوصاً سنہ ۱۸۵۲ع کے بعد شائع ہوئے ہیں ۔ ازاں جملہ سنہ ۱۸۷۱ع میں جان پلیٹ انسپکٹر مدارس ممالک متوسطہ نے اصل گلستاں مع انگریزی فرہنگ کے حسن اہتمام اور صحت کے ساتھ لندن میں چھپوائی تھی اور کپتان ولبر فورس کلارک نے بوستاں کا انگریزی ترجمہ سنہ ۱۸۷۹ع میں کیا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اُس نسخے سے کیا گیا ہے جو جرمنی کی اورینٹل سوسائٹی میں سنہ ۱۸۵۱ع میں چھپا تھا ۔ پھر حال ہی میں بوستاں کی چیدہ حکایتوں کا ترجمہ میجر میکنن نے نظم میں کیا ہے ، جس کا نام '' فلاورز فروم دی بوستاں'' رکھا ہے ۔

ہندوستان میں بھی متعدد زبانوں میں گلستاں کا ترجمہ ہوا ہے ۔ ازاں جملہ میر شیر علی افسوس تخلص نے مارکوئس ولزلی گورنر جنرل کے عہد میں اس کا اردو ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں لکھا ہے ، مگر چونکہ اُس وقت تک اردو زبان خوب منجھ کر صاف نہ ہوئی تھی اس لیے زمانۂ حال کے ترجمے ، جو اس کے بعد ہوئے ہیں ، زیادہ صاف اور بامحاورہ اور فصیح ہیں ۔ بنگالی اور گجراتی میں بھی گلستاں کے ترجمے ہوئے ہیں مگر ان کا مفصل حال معلوم نہیں ہے ۔ بھاشا میں اول شمال مغربی اضلاع میں گلستاں کے آٹھویں باب کا ترجمہ کیا گیا تھا ، جس کی اشاعت کو تقریباً تیس برس گزرے ہوں گے ۔ اس ترجمے کا نام مترجم نے ' پُشپوپ باڑکا ' (یعنی باغ کی ایک کیاری) رکھا ہے ۔ اس کے بعد ہمارے دوست پنڈت مہر چند داس مہاجن اگّروال جینی مذہب متوطن قصبۂ سونی پت ضلع دہلی نے حال ہی میں ساری گلستاں کا ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں نہایت کوشش سے کیا ہے ، جو اب تک شائع نہیں ہوا ۔ اس ترجمے کا نام 'پُشپوپ بن' رکھا ہے جو کہ لفظ 'گلستاں' کا مرادف ہے ۔ پنڈت صاحب نے پند نامہ

شیخ یعنی 'کریما' کا بھی بھاشا ترجمہ چوپائی وزن کی نظم میں لکھا ہے جس کا نام 'سیکشا پتری' ہے۔ ×شاید[1] نامناسب نہ ہوگا اگر 'پشپوپ بن' میں سے چند فقرات اور ابیات کا ترجمہ مع اصل کے اس مقام پر بطورِ نمونہ نقل کیا جائے:

علم چندانکہ بیشتر خوانی
چوں عمل در تو نیست نادانی
نہ محقق بود، نہ دانش مند
چار پائے برو کتابے چند
آں تہی مغز را چہ علم و خبر
کہ برو ہیزم ست یا دفتر

ترجمہ

پڑھ کتنے ہی شاستر گُوڈ[2]
جو آچرن نہیں ہے مُوڈ
کھوجی ہوئے نہ اور دھیان
پیٹھ چتشپد لدے پُران

۱۔ گلستاں کے بھاشا ترجمے کے متعلق یہاں سے آخر تک کی عبارت مع حواشی کے پہلے ایڈیشن میں ہے مگر بعد کے کسی ایڈیشن میں نہیں پائی جاتی۔ ہم نے پہلے ایڈیشن کی اس عبارت کے اول و آخر میں کانٹی (×) کا نشان لگا دیا ہے۔ (اسماعیل پانی پتی)

۲۔ × گوڈ: دقیق۔ آچرن: عمل۔ موڈ: احمق۔ کھوجی: محقق۔ دھیان: عقلمند۔ چتشپد: چوپایہ۔

وہ جڑ بدھ[1] کرت نہیں درشٹ
لکڑی دا پستک مم پرشٹ

خواہندۂ مغربی در صف بزازانِ حلب میگفت ''اے خداوندانِ نعمت! اگر شمارا انصاف بودے و مارا قناعت ، رسمِ سوال از جہاں برخاستے۔''

ترجمہ

ایک پشچمی[2] بھکشک حلب نگر کے کپڑا بیچنے والوں کی منڈلی میں کہتا تھا بھو درِبیا دھیشو ید تمہارے میں نیائے ہوتا اور ہمارے سنتوش تو مانگنے کی ریت جگت سے اٹھ جاتی۔

اے قناعت تونگرم گرداں
کہ ورائے تو ہیچ نعمت نیست
کنجِ صبر اختیارِ لقمان ست
ہر کرا صبر نیست حکمت نیست

ترجمہ

ہے سنتوش مجھے دھنوان
کر تجھ بِن سمپت نہیں آن
یہ سنتوش کوش سکھراس
ہے لکمان چتر کے پاس

---

۱ - جڑھ بدھ : احمق - درشٹ : دیکھنا - دا : حرف تردید یعنی یا - پستک : کتاب - مم : میری - پرشٹ : پشت -

۲ - پشچمی : پچھم کا رہنے والا - بھکشک : بھکاری - منڈلی : مجمع - بھو : حرفِ ندا - دریبا دھیش : دولت مند - ید : اگر - سنتوش : صبر - دھنوان : دولت مند - سمپت : دولت یا نعمت - کوش : خزانہ - سکھراس : راحت - لکمان : لقمان - چتر : دانش مند -

جا کے من سنتوش نہ ہوئے
پنڈتیتا دھورے نہیں سوئے

دو کس رنج بیہودہ بردند و سعی بے فائدہ کردند ، یکے آنکہ اندوخت و نخورد ، دیگر آنکہ آموخت و نکرد ۔

ترجمہ

دو منشوں نے نررتھک کلیش کیا اور برتھا پریشرم اٹھایا ۔ ایک وہ جس نے سنچے کیا اور نہ بھوگا ، دوسرا وہ جس نے پڑھا اور نہ گُنا ۔×

ترجموں کے علاوہ گلستاں بلکہ بوستاں کی بھی بہت سی شرحیں اور فرہنگیں لکھی گئی ہیں ، جن میں سے خان آرزو کی 'خیابان گلستاں' اور ٹیک چند کی 'بہار بوستاں' زیادہ مشہور ہیں ۔ علی الخصوص گلستاں کی قدر و منزلت ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی ہے ۔ جس طرح اہلِ علم نے مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کیے ہیں اور شرحیں وغیرہ لکھی ہیں ، یا اہلِ تعلیم نے فارسی تعلیم کی بنیاد اُس پر رکھی ہے یا منشیوں نے اُس کے فقرات و ابیات سے اپنے منشآت کو زینت دی ہے ، اسی طرح اُمراء نے اس کے نسخے نہایت خوشخط لکھوا لکھوا کر ان کو مطلّا اور مُذہّب کرایا ہے ۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک کے رئیسوں نے بھی ، جو درس و کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے ، اس کی حد سے زیادہ قدر کی ہے ۔ بعضوں نے ایک ایک نسخے کی تیاری اور تزئین میں لاکھ لاکھ روپے کے قریب صرف کیا ہے ۔

من : دل ۔ پنڈتتا : فضیلت ۔ دھورے : قریب ۔ سوئے : اس کے ۔ منش : آدمی ۔ نررتھک : بے فائدہ ۔ کلیش : تکلیف ۔ برتھا : بے فائدہ ۔ پریشرم : کوشش ۔ سنچے کرنا : جمع کرنا ۔ بھوگنا : کھانا ۔ گُننا : عمل کرنا ۔×

اگرچہ ان باتوں کو کتاب کی اصلی عظمت اور خوبی سے کچھ تعلق نہیں ہے ، لیکن گلستاں کی عام قبولیت پر اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کے رئیس اس کو اس قدر عزیز رکھیں ۔ گویّا اپنے گانے پر کبھی ایسا فخر نہیں کرتا جیسا اُس وقت کرتا ہے کہ ایک اناڑیوں کی مجلس میں جا پھنسے اور ان کو محظوظ کر کے اُٹھے ۔

گلستاں کے ابواب کی عمدہ ترتیب ، اُس کے فقروں کی برجستگی ، اُس کے الفاظ کی شستگی ، اُس کے استعارات کی جزالت ، اُس کی تمثیلات و تشبیہات کی طُرفگی اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شیخ نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک معتدبہ حصہ اس کی تصنیف میں صرف کیا تھا اور اس کی تنقیح و تہذیب میں اپنے فکر اور سلیقے سے پورا پورا کام لیا تھا ۔ چنانچہ دیباچۂ گلستاں کے اخیر میں اس نے صاف کہا ہے کہ ''برخے از عمرِ گرانمایہ برو خرج کردیم''۔ مگر دیباچے ہی کی ایک اور عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس فصلِ بہار کے آغاز میں اس کا لکھنا شروع ہوا تھا ، وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہوگئی ، اور اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ شیخ نے گلستاں چند مہینے سے زیادہ میں نہیں لکھی ، مگر یہ بالکل غلط ہے ۔ جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں ، وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذّت اور قبولیّت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس کے ایک ایک لفظ میں مصنّف کے خونِ جگر کی چاشنی نہ ہو ۔ اور جس قدر اس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے ، اُسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اس کی درستی اور کانٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی ۔ یورپ میں اکثر نامی مصنّفوں کے مسودے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط اور حفاظت سے رکھے گئے ہیں ۔ چنانچہ اٹلی

کے شمالی حصے میں جو فریرا ایک بستی ہے ، وہاں مشہور مصنّف ایرسٹو کے مسوّدے اب تک موجود ہیں - اس مصنف کا کلام سادگی اور صفائی اور بے تکلفی میں مشہور ہے - مگر اس کے مسوّدے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فقرے لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور جد سے زیادہ صاف ہیں ، وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹے گئے ہیں - لارڈ میکالے، جو انگلستان کا نہایت مشہور اور مقبول مصنف ہے ، اُس کا ایک مسودہ لندن میوزیم میں رکھا ہے - اُس میں جا بجا کاٹ پھانس اور حک و اصلاح پائی جاتی ہے ، یہاں تک کہ بعض فقرے دس دس دفعہ کاٹے گئے ہیں - ظاہرا شیخ نے جو گلستاں کے دیباچے میں فصلِ بہار کا ذکر کیا ہے ، اس کا مطلب یہ ہے کہ گلستاں کے لیے جو سرمایہ اُس نے سالہا سال میں جمع کیا تھا ، وہ پہلے سے اس کے پاس نا مرتّب موجود تھا - جب وطن میں پہنچا تو دوستوں کی تحریک سے اس کو مرتّب کر دیا - یہ ترتیب فصلِ بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اس کے تمام ہونے سے پہلے ختم ہو گئی - گلستاں اور نیز بوستاں کی ترتیب جس سلیقے سے شیخ نے کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اس کام میں بہت دقّت اٹھانی پڑی ہوگی - اس نے ان کتابوں میں زیادہ تر وہ واقعات لکھے ہیں جو خود اس پر گزرے ہیں یا اس کے سامنے پیش آئے - اور ہر ایک باب کی تکمیل کے لیے کسی قدر حکایتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو کسی سے سنیں یا کتابوں میں پڑھیں - اس تمام مجموعے کو گلستاں میں آٹھ باب پر اور بوستاں میں دس باب پر تقسیم کیا ہے - اور ہر ایک باب میں اس کے مناسب حکایتیں درج کی ہیں - اور ظاہرا علمِ اخلاق کی کوئی فرع ایسی نہیں ہے جو بقدرِ ضرورت ان میں سے ہر ایک کتاب میں بیان نہ کی گئی ہو - یہ بات تقریباً ایسی ہی مشکل تھی جیسے کوئی شخص اپنی سیر و سیاحت کے واقعات ایسی ترتیب

سے لکھے کہ اس میں علمِ اخلاق کے ہر ایک باب کا مطلب اجمالاً یا تفصیلاً بقدرِ ضرورت آ جائے - اس ترتیب کی قدر اس وقت معلوم ہو سکتی ہے کہ دونوں کتابوں کی اصل حکایتوں کو نا مرتّب کر کے گڈمڈ کر دیا جائے اور ہر ایک حکایت سے جو نتیجے شیخ نے استخراج کیے ہیں ، وہ ان میں درج نہ کیے جائیں ، اور پھر تمام مجموعۂ حکایات کو جدا جدا بابوں پر تقسیم کرایا جائے اور پوچھا جائے کہ وہ حکایت کون سے باب سے علاقہ رکھتی ہے اور یہ کون سے باب سے ؟

جس طرح ہر ملک میں لٹریچر کی ابتدا نظم سے ہوتی رہی ہے ، اسی طرح ایران میں بھی اول شاعری کا ظہور ہوا تھا اور دوسری صدی کے اخیر سے ، جب کہ اول ہی اول خواجہ عباس مروزی نے مامون کی مدح میں فارسی قصیدہ لکھا ، کئی صدیوں تک مقتضائے وقت کے موافق صرف شاعری کو ترقی ہوتی رہی - فارسی نثر لکھنا اگرچہ ایک مدت کے بعد شروع ہوگیا لیکن شیخ کے زمانے تک اس کی کوئی عام شاہراہ مقرر نہیں ہوئی - اکثر سیدھی سادی عبارت عام روزمرہ اور بول چال کے موافق لکھی جاتی تھی یا اہلِ علم کسی قدر خواص کے روزمرّہ میں تحریر کرتے تھے - چنانچہ حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ ، جو کہ پانچویں صدی (ہجری) میں لکھا گیا ، اس میں نہایت بے تکلّفی سے خواص کی معمولی بول چال میں حالات تحریر کیے گئے ہیں اور بعض ادیب اور فاضل ، جن پر عربیّت غالب تھی ، ان کے قلم سے بغیر فکر اور غور کے اکثر عربی لغات اور اشعار وغیرہ فارسی تحریروں میں تراوش کرتے تھے ، مگر نثر میں شاعرانہ شوخی اور جادو پیدا کرنا اور اس کے فقروں میں ایک خاص قسم کے وزن اور تول کا لحاظ رکھنا جاری نہ ہوا تھا - خصوصاً کوئی اخلاقی کتاب عمدہ نثر میں شیخ کے زمانے تک ایسی

نہیں لکھی گئی تھی ، جس میں اخلاق کا بیان واقعات نفس الامری کے ضمن میں کیا گیا ہو ۔ سنہ ۵۵۱ھ[1] میں قاضی حمیدالدین ابوبکر نے 'مقامات بدیعی' اور 'مقامات حریری' کی طرز پر فارسی میں 'مقامات حمیدی' لکھی ہے ، اس میں نہایت تکلف اور تصنع پایا جاتا ہے ۔ اس کی بنیاد زیادہ تر صنائع لفظی پر رکھی ہے اور تمام کتاب بدیعی اور حریری کی طرح مقفیٰ اور مسجع لکھی ہے ، اور جس طرح ان دونوں کتابوں میں فرضی قصے وضع کیے گئے ہیں ، اسی طرح اس میں بھی محض خیالی افسانے لکھے ہیں جن میں گھٹانے بڑھانے اور ہر قسم کے تصرف کرنے کا اختیار مصنف کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ اس کتاب کے پڑھنے سے کوئی خیال اس کے سوا دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف کو عربی لغات پر بہت عبور تھا اور تجنیس و ترصیع اور دیگر صنائع لفظی کے برتنے پر کافی قدرت رکھتا تھا ۔

ایک اور کتاب موسوم بہ 'قابوس نامہ' پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہماری نظر سے گزری ہے جس کا مصنف قابوس[2] بن سکندر ملقب بہ 'عنصرالمعالی ہے ۔ یہ تمام کتاب اخلاق اور آداب معاشرت میں لکھی گئی ہے ۔ اس کا بیان بہت صاف اور سادہ ہے اور مضامین عمدہ ہیں ، لیکن اس کے سوا کوئی ندرت یا دلفریبی

---

۱ ۔ یہاں اصل کتاب میں ''عیسوی'' کا لفظ لکھا ہوا ہے جو کتابت کی غلطی ہے ۔ (اسماعیل پانی پتی)

۲ ۔ یہ شخص دیالمۂ آل زیار میں سے ایک بادشاہ ہے جس نے 'جرجان اور گیلان وغیرہ میں اکیس برس حکمرانی کی ہے اور سنہ ۴۶۲ ہجری میں وفات پائی ۔

اس کی عبارت میں نہیں پائی جاتی -

غرض کہ شیخ نے آنکھ کھول کر نثر کا کوئی ایسا عمدہ نمونہ نہیں دیکھا تھا جس کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ گلستاں کی بنیاد اُس پر رکھی گئی ہوگی - حق یہ ہے کہ وہ خود ہی اس روش کا موجد تھا اور اُسی پر اُس کا خاتمہ گیا -

اُس نے اپنی دونوں بے نظیر کتابوں میں ، برخلاف عام ایرانی نثّاروں کے ، اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی ظاہر کرنی یا اپنا تفلسف اور تبحّرِ علمی جتانا یا عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھ کر لوگوں کا دل لبھانا اور عجائبات کا طلسم باندھ کر خلقت کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہا - اُس نے دونوں کتابوں میں باستثناء چند حکایتوں کے کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو عقل یا عادت کے خلاف ہو یا جس کو سن کر کچھ زیادہ تعجب ہو - وہ اکثر اپنی آنکھ کی دیکھی یا کان سے سنی یا کسی کتاب سے انتخاب کی ہوئی ایسی سیدھی سادی معمولی باتیں لکھتا ہے جو صبح سے شام تک ہر انسان پر گزرتی ہیں - عام حکایتیں ، جو ان دونوں کتابوں میں درج ہیں ، وہ اس قبیل کی ہیں کہ مثلاً ایک بدمعاش سائل نے اپنے کو قرض‌دار ظاہر کر کے ایک بزرگ سے دو دینار حاصل کیے - لوگوں نے کہا یہ تو مکار تھا ، اس کو کچھ دینا نہیں چاہیے تھا - فرمایا اگر مکار تھا تو میں اس کے شر سے بچا ورنہ وہ اَوروں کے شر سے بچا -

یا یہ کہ ایک بادشاہ زادے کے تاج کا لعل اندھیری رات میں ایک پتھریلی جگہ گر پڑا - بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ پتھریوں میں سے لعل پانا چاہتا ہے تو ہر پتھری کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ - یا یہ کہ میں چند درویشوں کے ساتھ روم میں پہنچا اور ہم سب ایک ذی‌مقدور شیخ کے ہاں اُترے - اُس نے ہماری ہر طرح سے

خاطر کی مگر کھانے کو کچھ نہ دیا ۔

ان سیدھی سادی حکایتوں کو وہ ایسے لطیف اسلوب سے بیان کرتا ہے اور ان سے ایسے پاکیزہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ ایک نہایت بے حقیقت بات حقیقت میں ایک نکتہ یا ایک دلچسپ قصہ معلوم ہوتا ہے ۔

گلستاں اور بوستاں کو پڑھ کر دو باتوں میں سے ایک بات کا ضرور اقرار کرنا پڑتا ہے ؛ یا تو یہ کہ انتخاب کرنے میں شیخ کا مذاق ایسا صحیح تھا کہ جو حکایت وہ ان کتابوں میں درج کرنی چاہتا تھا ، اُس میں کوئی نہ کوئی لطیف اور چبھتی ہوئی بات ضرور ہوتی تھی ، اور یا یہ کہ وہ اپنی خوش سلیقگی اور حسنِ بیان سے ایک مبتذل اور پیش پا افتادہ مضمون کو بھی اُسی قدر دل آویز طور پر بیان کر سکتا تھا جیسے ایک نرالے اور اچھوتے خیال کو ۔

تعجب ہے کہ شیخ کی گلستاں ، جو آئندہ نسلوں کے لیے نثرِ فارسی کا ایک لاجواب نمونہ تھی ، ایران میں اس کے تتبع کا کسی نے خیال نہیں کیا ، یا یوں کہیے کہ کسی سے اس کا تتبع نہیں ہو سکا ۔ اگرچہ شیخ کے بعد نثرِ فارسی کی ترقی یا وسعت انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور نثر لکھنے پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کمر باندھی جن کا علم و فضل شیخ سے بمراتب فائق تر تھا ، مگر سب کی ہمت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصور رہی ۔ ایران میں سب سے بڑا نثّار فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی سمجھا جاتا ہے جو شیخ کے اخیر زمانے میں ہوا ہے ۔ اُس کی مشہور کتاب 'تاریخ وصاف' سے بے شک اس کا کمالِ علمی اور عربی و فارسی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے ، لیکن

ساری کتاب میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا نکلے جو متوسط درجے کی استعداد کا آدمی ڈکشنری کھولے بغیر سمجھ سکے ، یا جس کا اندازِ بیان دل میں جا کر چبھے - سنہ ۷۱۲ ہجری میں ، جب کہ سلطان محمد اولجائتو خاں خُدا بندہ کے حکم سے آذربیجان میں شہر سلطانیہ بن کر تیار ہو چکا اور اس خوشی میں سلطان کی طرف سے تمام شہر کی دعوت کی گئی - اُس تقریب میں فضل اللہ بھی موجود تھا اور اُسی زمانے میں اُس نے 'تاریخ وصاف' ختم کی تھی - اس کتاب کی تقریب اور تعریف سلطان کے حضور میں کی گئی - سُلطان نے اُس میں سے کچھ متفرق فقرے پڑھنے کا حکم دیا - اُس وقت دربار میں وزیر رشیدالدین اور قاضی القضاۃ نظام الدین عبدالملک اور خواجہ اصیل الدین طوسی اور بڑے بڑے عالم اور فاضل موجود تھے - فضل اللہ نے چند دعائیہ فقرے ، کہ اُن سے زیادہ سلیس اور آسان عبارت شاید تمام کتاب میں نہ ہوگی ، خاص سلطان کے سنانے کو لکھے تھے ، وہ پڑھنے شروع کیے - سلطان ہر فقرے کے معنی رشید الدین وغیرہم سے پوچھتا تھا - یہ لوگ اس کی شرح بہت بسط کے ساتھ کرتے تھے ، تب سلطان کی سمجھ میں کچھ آتا تھا ، یا شرمے شرمائے کچھ ہاں ہوں کر دیتا تھا - یہ حال 'تاریخ وصاف' کی عبارت کا ہے - اس کے بعد بھی زیادہ تر نثر لکھنے والوں نے اسی بات میں کوشش کی ہے کہ ان کی نثر کے سمجھنے میں ناظرین کو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں اور ان کے علم و فضل اور ہمہ دانی کا اعتقاد دلوں میں پیدا ہو - مگر یہ ارادہ بہت کم کیا گیا ہے کہ مفید خیالات ، زود فہم الفاظ اور دلآویز عبارت میں ادا کیے جائیں -

تین کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جو شیخ کے بعد گلستاں کی طرز پر لکھی گئی ہیں ؛ ایک مولانا عبد الرحمان جامی کی

'بہارستان'، دوسری مجد الدین[1] خوافی کی 'خارستان'، تیسری حبیب[2] قاآنی شیرازی کی 'پریشان'۔ سو اول ہم 'بہارستان' اور 'خارستان' کا ذکر کرتے ہیں ۔ اگرچہ 'خارستان' کو عبارت کی خوبی اور جزالت کے لحاظ سے 'بہارستان' کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے، بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو 'خارستان' کا طریقۂ تحریر اکثر جگہ اہلِ زبان کی روش سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے، لیکن جب دونوں کو گلستاں کے مقابلے میں لایا جاتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور شمع دونوں کی روشنی کافور ہو جاتی ہے، اسی طرح 'بہارستان' اور 'خارستان' دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے، اور ایک کو دوسری سے بہتر کہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی ۔ حکایتیں اور روایتیں، جو ان دونوں کتابوں میں درج کی گئی ہیں، وہ فی الحقیقت گلستان کی حکایتوں سے بہت ملتی جلتی ہیں، اور زیادہ تر مجد الدین خوافی نے اپنی کتاب کے ابواب بھی اسی طریقے پر مرتب کیے ہیں، مگر شیخ کے حسنِ بیان اور لطفِ ادا سے گلستاں نے ایک خاص صورت پیدا کی ہے، جس کے سبب سے وہ بالکل انوکھی اور نرالی چیز معلوم ہوتی ہے ۔ ہر چند اس قسم کی ہم شکل اور ہم جنس کتابوں میں پورا پورا فرق اور امتیاز کرنا بغیر وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم کے ممکن نہیں ہے، لیکن چند متّحدالمضمون فقروں کے مقابلہ

---

۱ - یہ شخص اکبر کے عہد میں خراسان سے آیا تھا ۔ خواف، خراسان میں ایک مشہور بستی ہے ۔ کہتے ہیں کہ 'خارستان' اس نے اکبر کے حکم سے لکھی تھی ۔

۲ - یہ شخص زمانۂ حال کا ایک نہایت مسلّم اور مقبول شاعر ہے جس کو اہلِ ایران خاتم الشعراء سمجھتے ہیں ۔ اس کی وفات کو چالیس برس سے زیادہ نہیں گزرے ۔

کرنے سے کسی نہ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سا اسلوبِ بیان زیادہ صاف اور پاکیزہ و دلآویز ہے اور کون سا کم - اس لیے چند ایسی مثالیں ، جو نہایت دقّت اور جستجو سے بہم پہنچی ہیں ، اِس مقام پر نقل کی جاتی ہیں -

---

گلستان اور بہارستان کا مقابلہ

گلستان

اسکندر را پرسیدند کہ دیارِ مشرق و مغرب را بچہ گرفتی کہ ملوکِ پیشیں را خزائن و عمر و ملک و لشکر بیش از تو بود و چنیں فتحے میسّر نشد ؟ گفت بعونِ خدائے عزّ و جلّ ہر مملکتے را کہ گرفتم ، رعیتش را نیازردم و رسومِ خیراتِ گزشتگاں باطل نکردم و نامِ پادشاہاں جز بہ نکوئی نہ بردم ۔

بیت

بزرگش نخوانند اہلِ خرد
کہ نامِ بزرگاں بزشتی برد

قطعہ

ایں ہمہ ہیچ ست چوں می بگزرد
بخت و تخت و امر و نہی و گیر و دار
نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

بہارستان

اسکند را گفتند بچہ سبب یافتی انچہ یافتی از دولت و سلطنت و مملکت با صغرِ سن و حداثتِ عہد ؟ گفت بہ استمالتِ دشمناں تا از

غائلۂ دشمنی زمام تافتند و از تعاہدِ دوستاں تا در قاعدۂ دوستی استحکام یافتند ۔

بیت

بایدت ملکِ سکندر چوں وے از حسنِ سیر
دشمناں را دوست گرداں دوستاں را دوست تر

ان دونوں عبارتوں میں بہ اعتبارِ فصاحت و بلاغت کے جو فرق ہے ، اس کا فیصلہ زیادہ تر ذوقِ صحیح پر منحصر ہے مگر جس قدر قیدِ بیاں میں آ سکتا ہے وہ لکھا جاتا ہے ۔ لیکن اس سے محض گلستاں کی فوقیت جتانی مقصود ہے ، نہ کہ 'بہارستان' کی تنقیص کرنی ۔

اول : ''اسکندر را پرسیدند'' اور ''اسکندر را گفتند'' میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے ۔ سوال کے موقع پر 'پرسیدن' بہ نسبت 'گفتن' کے زیادہ مناسب ہے ۔

دوسرے : شیخ کے ہاں خزائن و عمر و ملک و لشکر چار لفظ ایک دوسرے پر معطوف ہیں اور کوئی لفظ حشو و بیکار نہیں ہے ۔ اور مولانا کے ہاں دولت سے اگر سلطنت مراد ہے تو سلطنت و مملکت دونوں ورنہ صرف لفظ مملکت حشو ہے اور صغرِ سن کے بعد حداثتِ عہد بھی حشو ہے ۔

تیسرے : شیخ کے بیان میں سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے ، کیوں کہ باوجود کمیِ لشکر و ملک و عمر و مال کے مشرق و مغرب کو فتح کرنا تعجب سے خالی نہ تھا ۔ اور مولانا کے ہاں سوال کی وجہ ایسی ظاہر نہیں ہے ، کیوں کہ تھوڑی سی عمر میں

بہتیرے لوگوں نے دولت اور سلطنت حاصل کی ہے -

چوتھے : اسکندر کا جواب جو شیخ نے نقل کیا ہے ، اُس میں ہرگز اس سے زیادہ اختصار کی گنجائش نہ تھی ورنہ سکندر کا جواب ناتمام رہتا - اور جو جواب مولانا نے نقل کیا ہے ، وہ ان لفظوں میں ادا ہو سکتا تھا : ''بہ استمالتِ دشمناں و تعاہدِ دوستاں -'' اس سے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی -

پانچویں : شیخ نے جو نتیجہ حکایت کے مضمون سے نکال کر اشعار میں بیان کیا ہے ، وہ کئی وجہ سے مولانا کے نتیجے کی نسبت زیادہ بلیغ ہے - شیخ کا نتیجہ لازمی ہے اور مولانا کا نتیجہ غیرلازمی ، کیونکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو زیادہ دوست بنا لے گا ، اس کو ضرور سکندر جیسی[1] سلطنت حاصل ہو جائے گی - اس کے سوا مولانا نے حقیقت میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا ، بلکہ حکایت کا خلاصہ ایک بیت میں دوبارہ بیان کر دیا ہے - اور شیخ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک اچھوتا مضمون ہے کہ جب تک بیان نہ کیا جائے ، ہر شخص کا ذہن وہاں تک انتقال نہیں کر سکتا - نیز شیخ نے ایسا حاوی نتیجہ نکالا ہے جو تمام مخلوق کو شامل ہے ، کیوں کہ سلف کی تعظیم اور ادب اور ان کے محاسن و کمالات کی قدر کرنی ہر شخص کے حق میں مثمر برکات ہے - اور مولانا کا نتیجہ صرف سلاطینِ اولوالعزم کے ساتھ مخصوص ہے ، کیونکہ ملک سکندر کی خواہش اُن کے سوا اَور کسی کو نہیں ہوتی -

---

۱ - نسخۂ اول میں 'کیسی' -

گلستان

رازیکہ نہاں خواہی با کس درمیان منہ ، اگرچہ دوست باشد کہ مر آں دوست را نیز دوستاں باشند و ہم چنیں مسلسل ۔

قطعہ

خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش
با کسے گفتن و گفتن کہ مگوے
اے سلیم آب ز سر چشمہ بہ بند
کہ چو پُرشد نتواں بستن جوے

بیت

سخنے در خلا نباید گفت
کاں سخن برملا نشاید گفت

بہارستان

اسرارِ نہانِ خود را با ہیچ دوستی درمیاں منہ ، زیرا کہ بسیار بود کہ در دوستی خلل افتد و بہ دشمنی بدل گردد ۔

قطعہ

اے پسر سترے کش از دشمن نہفتن لازم ست
بہ کہ از افشاے آں با دوستے کم دم زنی
دیدہ ام بسیار کز سیرِ سپہرِ کج نہاد
دوستاں دشمن شوند و دوستیہا دشمنی

قطعہ

بر سترِ سر بمہر کہ افتد بخاطرت
سرعت مکن بہ موج بیانش نگاشتن
ترسم شود غرامتِ اظہارِ آں ترا
مشکل تر از ندامتِ پوشیدہ داشتن

اس مثال میں بھی 'گلستاں' کا بیان 'بہارستاں' کی نسبت چند وجوہ سے زیادہ بلیغ ہے -

۱ - شیخ کہتا ہے ''رازیکہ نہاں خواہی'' یعنی جس بھید کو چھپانا منظور ہو ، اسے کسی سے نہ کہو - اور مولانا کہتے ہیں ''اسرارِ نہانِ خود را'' یعنی اپنے پوشیدہ بھیدوں کو ظاہر نہ کرو - حالانکہ بعض بھید کیسے ہی پوشیدہ ہوں ، ایک مدت کے بعد کہنے کے لائق ہو جاتے ہیں ، مگر جن کا چھپانا منظور ہوتا ہے ، وہ کبھی کہنے کے لائق نہیں ہوتے -

۲ - شیخ کہتا ہے ''با کس درمیان منہ اگرچہ دوست باشد'' اور مولانا کہتے ہیں ''با ہیچ دوستے درمیان منہ''- پہلے بیان میں دوست اور غیر دوست سب سے راز کہنے کی ممانعت ہے ، مگر دوسرا بیان جب تک اس طرح نہ ہو ''با دوست ہم درمیان منہ'' تب تک اس میں تعمیم پیدا نہیں ہوتی -

۳ - شیخ نے راز نہ کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کے بھی دوست ہوں گے اور ان دوستوں کے بھی دوست ہوں گے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلا جائے گا - پس چپکے ہی چپکے راز جمہور میں پھیل جائے گا - مولانا نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ شاید

دوستی میں خلل آجائے اور دوست دشمن ہو جائے - اگرچہ مطلب دونوں صحیح ہیں لیکن پہلی وجہ زیادہ موجّہ ہے کیونکہ یقیناً کوئی شخص دوستوں سے خالی نہیں ہوتا اور دوستی میں فرق آ جانا کبھی ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا -

۴ - شیخ کا قطعہ بلاغت میں مولانا کے قطعے سے بمراتب افضل اور فائق تر ہے - پہلی بیت میں اس نے انسان کی ایک ایسی غامض اور دقیق خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام نظروں سے مخفی ہے - وہ کہتا ہے ''خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش - با کسے گفتن و گفتن کہ مگوے''- یعنی کسی سے اپنا بھید کہہ کر اس کو افشاے راز سے منع کرنا کچھ مفید نہیں ہے، کیونکہ انسان ممنوعات پر زیادہ حریص ہوتا ہے، اس لیے اب اس کو ضبطِ راز کرنا اور بھی مشکل ہوگا - پس اس سے خاموشی ہی بہتر ہے - دوسری بیت میں ایک نہایت لطیف اور واضح مثال سے مطلب کو خاطر خواہ دل نشین کیا ہے - مولانا کے قطعے میں کوئی خوبی اس مضمون کے سوا نہیں ہے کہ جو راز دشمن سے چھپانا چاہیے، اسے دوست سے بھی چھپانا چاہیے، مگر ساتھ ہی 'افشا' کا لفظ زائد معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ''ازاں دم نہ زنی'' کی جگہ ''از افشاے آں دم نہ زنی'' کہا گیا ہے اور قطعہ کا اخیر مصرع بھی حشو یا تکرار سے خالی نہیں ہے؛ دوستوں کا دشمن ہو جانا اور دوستی کا دشمنی ہو جانا فی الحقیقت ایک ہی بات ہے -

۵ - قطعے کے بعد شیخ نے ایک فرد لکھی ہے جو فی الواقعہ سہل و ممتنع ہے، یعنی ''سخنے در خلا نباید گفت - کاں سخن برملا نشاید گفت''- یہ دھوکا اکثر اشخاص کو ہو جاتا ہے کہ جب صحبت میں کوئی غیر جنس نہیں ہوتا تو ناگفتی باتیں کہنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تخلیے میں گفتگو کر رہے ہیں، اس

سے اغیار مطلع نہیں ہو سکتے ، حالانکہ وہ باتیں ضرور رفتہ رفتہ منتشر ہو جاتی ہیں۔ اس مجرّب اور سچے مضمون کو ، جو کسی قدر دقیق بھی تھا ، ایسے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ بیان کی صفائی ممکن نہیں - پھر 'خلا' اور 'ملا' اور 'در' اور 'بر' کا مقابلہ اور صنعتِ ذوقافیتین اس کے علاوہ ہے - مولانا نے کوئی فرد نہیں لکھی ، مگر ایک دوسرا قطعہ لکھا ہے یعنی ''ھر سرّ ِسر بمہر کہ افتد بخاطرت الخ'' اس میں پہلے مصرع سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جو رازِ سربستہ تیرے خیال یا دل میں گزرے اور مطلب یہ ہے کہ جو بھید تیرے دل میں موجود یا مستور ہو - پھر ''بموج بیانش نگاشتن'' کا لفظ ''در اظہار آں'' کی جگہ لایا گیا ہے جس میں نہایت تکلف ہے - پھر اخیر مصرع میں 'ندامت' کا لفظ شاید بے محل ہے ، کیونکہ اخفائے راز سے کبھی ندامت نہیں ہوتی - باوجود ان تمام باتوں کے دونوں مثالوں میں شیخ کے ہاں کوئی لفظ غریب یا غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا اور مولانا کے ہاں اکثر الفاظ بمقابلۂ گلستاں کے الفاظ کے غریب معلوم ہوتے ہیں ، جیسے حداثتِ عہد ، غائلہ ، تعاہد ، بموجِ بیانش نگاشتن ، غرامت -

گلستان اور خارستان کا مقابلہ

گلستاں

حکیماں دیر دیر خورند و عابداں نیم سیر ، و زاہداں تا سدِّ رمق و جواناں تاطبق برگیرند و پیراں تا عرق کنند - امّا قلندراں چنداں خورند کہ در معدہ جائے نفس نماند و بر سُفرہ روزیِ کس -

بیت

اسیر بند شکم را دو شب نگیرد خواب
شبے ز معدۂ سنگی شبے ز دل تنگی

خارستان

ہر کہ در گرسنگی طاقت نیارد باید کہ سہ یک شکم را از طعام پُر کند و سہ یک دیگر از آب و سہ یک دیگر از برائے نفس زدن رِہا کند ـ امّا صوفیانِ وقتِ ما میگویند کہ تُو ہمہ شکم را از طعام پُر کن ـ آب خود چیز لطیف است ، خود را جائے میکند کہ لطیفاں را جائے کم نباشد و نفس را جائے گو مباش ـ

بیت

بشنو کہ چہ گفت صوفی پرواری
چوں سیر شدی چرا غمِ جاں داری

گلستان

عالمِ ناپرہیزگار کورِ مشعلہ دارست یُہدی بہ و ہو لا یہتدی ـ

بیت

بیفائدہ ہر کہ عمر درباخت
چیزے نخرید و زر بینداخت

خارستان

علم باعمل ہمچو طعام بانمک ست ، ہر کرا ہردو ہست حکمتے تمام دارد ، و طعام بے نمک را چہ تواں کرد ـ

بیت

عمل بے علم نامضبوط باشد
ہمیشہ شرط با مشروط باشد

مذکورہ بالا مثالوں کو دیکھ کر غالباً ہر شخص ، جو فارسی زبان سے فی‌الجملہ آشنا ہے ، بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ 'خارستان' کی عبارت 'گلستان' کے مقابلے میں کس قدر کم وزن اور بے وقعت ہے - اسی لیے ہم اس مقام کو ناظرین کے مذاق اور تمیز پر چھوڑ دیتے ہیں اور زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے -

'پریشان' کا مصنّف مرزا حبیب قاآنی کتابِ مذکور کے خاتمے کے اشعار میں تصریح کرتا ہے کہ اس کی عمر تیس برس سے بھی دو تین برس کم تھی جب یہ کتاب اس نے لکھی ہے اور شیخ نے 'گلستان' کو سنِ کہولت اور اوائلِ سنِ شیخوخت میں مرتّب کیا ہے - پس اگر قاآنی سے 'گلستان' کا پورا پورا تتبّع نہ ہوسکا ہو تو کچھ تعجّب نہیں ، کیونکہ ایک ایسی کتاب کا سرانجام کرنا ، جس کی بناء محض حکمت اور تجربت پر ہونی چاہیے ، شیخ کے مقابلے میں ایک نوجوان ناتجربہ کار کی طاقت سے باہر تھا ، بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو بڑی عمر میں قاآنی سے 'گلستاں' کا جواب اتنا بھی لکھا جانا مشکل تھا ، کیونکہ اس کی تمام عمر قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی ہے ، جس میں محض خیالی ڈھکوسلے باندھنے اور الفاظ تراشنے کے سوا حقیقت اور واقعیّت سے کچھ غرض نہیں ہوتی - پس جس قدر قصیدہ گوئی میں اس کو مشق و مہارت زیادہ بڑھتی جاتی تھی ، اسی قدر بیانِ حقائق اور واقعہ نگاری کا ملکہ اس سے سلب ہوتا جاتا تھا - قاآنی نے بھی 'گلستان' کی طرح 'پریشان' کی عبارت دلچسپ اور دلآویز کرنے میں بہت کوشش کی ہے ، مگر سوا اس کے کہ تمام کتاب

کو ہزل اور فحش سے بھر دیا اور چند آزاد اور بے باک نوجوانوں کی ضیافتِ طبع کا سامان مہیّا کر دیا، اور کچھ اس سے نہیں ہو سکا۔ خاتمۂ کتاب کے سوا، جس میں اس نے ابنائے ملوک کے لیے پند پند کر کے کچھ نصیحتیں لکھی ہیں، تمام کتاب میں وہ حکایتوں کی بنیاد اکثر نہایت غلیظ، فحش یا سخیف ہزل پر رکھتا ہے، جس کے پڑھنے سے شرم آتی ہے۔ اور طُرّہ یہ کہ پھر اس سے نتائج عارفانہ اور متصوّفانہ استخراج کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ 'پریشان' کا خاتمہ، جس میں شوخی و ظرافت کا کچھ سامان نہیں ہے، باب ہشتمِ گلستاں کے مقابلے میں نہایت پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام خاتمے میں شاذ و نادر ہی کوئی مضمون ایسا ہوگا جس میں کوئی ندرت پائی جائے۔ عبارت بے شک عمدہ ہے مگر شیخ کی جادو بیانی کا کہیں نشان نہیں پایا جاتا۔ عام نصائح، جو خاتمے میں درج ہیں، وہ اس قبیل کی ہیں:

"پند: پادشاہ باید بسخنِ سخن چیناں اعتماد نکند۔

پند: پادشاہ باید دین را توقیر کند و دشمنانِ دین را تحقیر فرماید۔

پند: پادشاہ باید از خدا غافل نماند تا خدائے از و غافل نباشد۔

پند: پادشاہاں را در نظامِ ممالک دستِ دُر افشاں بکارست و تیغِ سر افشاں۔

بیت

تاکہ بداں دوستاں شوند فراہم
تاکہ بدیں دشمناں شوند پریشاں"

اور اگر کہیں عبارت میں اس سے زیادہ حسن پیدا کرنا چاہتا ہے ، وہاں حقیقت سے دور جا پڑتا ہے ۔ مثلاً :

''پند : پادشاہ باید تواضع کند و تکبّر نفرماید کہ تواضع صفتِ اتقیاست و تکبّر صفتِ اشقیا ۔ و من گفتہ ام اہلِ تکبّر را در نطفہ غش ست ، چہ سرکشی صفتِ آتش ست و شیطان از آتش بود ۔ و اہلِ تواضع را نطفہ پاکست ، چہ افتادگی صفتِ خاک ست و آدم از خاک بود ۔''

اس پند کے پہلے حصے میں ظاہر ہے کہ کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے اور دوسرے حصے میں ، جو اس نے کچھ ندرت پیدا کرنی چاہی ہے ، وہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے اور وہ بھی اچھی طرح بیان نہیں ہوسکا ۔ اسی مضمون کو شیخ نے 'بوستاں' میں اس طرح بیان کیا ہے :

ز خاک آفریدت خداوند پاک
پس اے بندہ اُفتادگی کن چو خاک

حریص و جہاں سوز و سرکش مباش
ز خاک آفریدندت آتش مباش

چو گردن کشید آتشِ ہولناک
بہ بیچارگی تن بینداخت خاک

چو آں سرفرازی نمود ایں کمی
ازاں دیو کردند ، ازیں آدمی

البتہ جو عذر کہ قاآنی نے 'پریشان' کے دیباچے میں کیا ہے

اور 'گلستاں' کے مقابلے میں کتاب لکھنے سے اپنا عجز ظاہر کیا ہے ، اُس سے اُس کا نہایت انصاف اور 'گلستاں' کی قدرشناسی ثابت ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے احباب کے نہایت سخت جبر سے 'پریشاں' کے لکھنے پر قدم اُٹھایا تھا - وہ لکھتا ہے کہ ''ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار کیا کہ گلستاں کی طرز پر نظم و نثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیے - میں نے کہا : ''بھائی ! توبہ کر ، میں اور شیخ کی طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں؟ مسیلمہ نے نبوّت کا دعویٰ کر کے کذّاب کے سوا اور کچھ خطاب نہیں پایا - میں نے مانا کہ جگنو رات کو چمکتا ہے ، لیکن کیا وہ چاند کی برابری کر سکتا ہے ؟ شیخ کی گلستاں ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتّی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں اور اہلِ معنی کی جان قیامت تک اس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے - آخر جب اُس نے نہ مانا اور میرے انکار سے اُس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبوراً کچھ نظم و نثر اور جدّد ہزل ترتیب دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پرواز میں شہباز کی برابری نہیں کرسکتی ، لیکن اُس کو بھی چار ناچار اُڑنا ہی پڑتا ہے -''

اب ہم چند ایسے فقرے 'گلستاں' اور 'پریشاں' سے انتخاب کر کے لکھتے ہیں جو متّحدالمضمون ہیں :

گلستان اور پریشان کا مقابلہ :

گلستان

اے فرزند دخل آبِ روان ست و خرج آسیاے گرداں ، یعنی خرج فراواں کردن مسلّم کسے راست کہ دخلے معیّن دارد -

قطعہ

چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن
کہ میگویند ملّاحاں سرودے
اگر باراں بہ کوہستاں نبارد
بسالے دجلہ گردد خشک رودے

پریشان

دخل سر چشمہ ست و مخارج جوئے چند کہ آبِ سرچشمہ در انہار جاری است ۔ ولا شک چوں سرچشمہ مسدود شود ، جوئہا خشک شود ۔ پس ہر کس آب در جو جاری خواہد سرچشمہ را رعایت کند ۔

ایضاً

خرج بہ اندازۂ دخل باید کرد ، نہ آں کہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم ۔ چہ ایں معنی بغایت نامعقول ست کہ بار در پیش قدم و بارگیر در حیّز عدم باشد ۔

قطعہ

آلا اے آنکہ خرجت ہست موجود
بکارت مے نیاید دخلِ معدوم
شنیدستی کسے از بہرِ جولاں
نشیند بر فرازِ اسپِ موہوم

اس مثال میں 'گلستاں' سے صرف ایک عبارت اور 'پریشاں' کے دو مختلف مقامات سے دو عبارتیں ایک ہی مضمون کی نقل کی

گئی ہیں ، مگر شیخ کا بیان قاآنی کی دونوں عبارتوں سے زیادہ بلیغ ہے - لیکن جو فرق بہت باریک اور نازک ہیں ، اُن کا بیان کرنا اول تو مشکل ہے ، دوسرے یہ امید نہیں کہ ناظرین اس کو غور سے دیکھیں گے ، اسی لیے صرف ایسے فرق بتائے جاتے ہیں جو زیادہ روشن اور صاف ہیں - شیخ کے بیان میں مخاطب کو فرزند کے ساتھ تعبیر کرنا عین مقتضاے مقام ہے - ایک تو اظہارِ شفقت ، جو ناصح کے لیے ضرور ہے ، دوسرے یہ جتانا کہ نوجوان ہی اکثر اس نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں - پھر دخل و خرج کی تشبیہ ، آبِ رواں اور پن چکی کے ساتھ کیسی عمدہ تشبیہ ہے کہ جس قدر نرالی ہے اسی قدر جچی تُلی بھی ہے - پن چکی بھی بدون آبِ رواں کے نہیں چلتی اور خرچ بھی بغیر آمدنی کے نہیں چلتا - پن چکی بھی پانی بند ہو جانے پر کسی عارضی قوت سے چلائی جاتی ہے تو اس کی گردش عارضی اور بے ثبات ہوتی ہے - خرچ بھی جو بدون آمدنی کے اندوختہ وغیرہ سے چلتا ہے ، بے بنیاد اور ناپائدار ہوتا ہے - پھر اس تمام مطلب کو ، جو کہ ہم نے تشبیہ کے معنی سمجھانے کے لیے لکھا ہے ، شیخ نے ان مختصر اور جامع لفظوں میں ادا کیا ہے - یعنی ''خرج فراوان کردن مسلّم کسے راست کہ دخلے معیّن دارد''- اس کے بعد قطعے میں ایک نہایت بدیہی مثال دے کر بے بنیاد خرچ کا مآل ہر شخص کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا ہے اور اس مقولے کو ملّاحوں کی طرف منسوب کر کے یہ جتایا ہے کہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ دجلے کے کنارے پر ہمیشہ ملّاحی گیتوں میں گائی جاتی ہے - قاآنی نے آمدنی کو منبع سے اور اخراجات کو ندیوں سے تشبیہ دی ہے - تشبیہ یہ بھی عمدہ ہے ، مگر یہ شیخ کی اس تمثیل سے ماخوذ ہے جو اس نے قطعے میں بیان کی ہے ، لیکن چونکہ یہ تمثیل نہایت موٹی

اور معمولی تھی اس لیے شیخ نے اس کو ملاحوں کی طرف منسوب کیا ہے اور قاآنی کو یہ بات نہیں سوجھی - پھر قاآنی کے بیان سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سر چشمے کے بند ہوتے ہی ندیاں خشک ہو جاتی ہیں اور شیخ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مدت کے بعد خشک ہوتی ہیں اور فی الواقعہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا شیخ نے لکھا ہے - پھر شیخ نے منبع کے بند ہو جانے کو قدرتی اسباب یعنی امساکِ باراں کی طرف مستند کیا ہے اور یہ کہا ہے ''اگر باراں بکوہستاں نبارد'' اور قاآنی کہتا ہے کہ جو شخص ندی کا جاری رہنا چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے ، یعنی اس کو بند نہ ہونے دے ، حالانکہ یہ امر انسان کی طاقت سے باہر ہے - پھر قاآنی نے تمثیل سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جو شخص ندی کا جاری رہنا چاہے ، وہ سرچشمے کی خبر رکھے - اگرچہ مطلب اس سے بھی مفہوم ہو جاتا ہے ، لیکن اس جگہ مقتضائے مقام کے موافق اس کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ جو شخص ہمیشہ اپنا خرچ جاری رکھنا چاہے ، اس کو آمدنی پر نظر رکھنی چاہیے ، کیونکہ تمثیل اسی مطلب کے سمجھانے کو دی گئی ہے ، نہ اس بات کے سمجھانے کو کہ اگر ندی میں پانی جاری رہنا چاہو تو سرچشمے کی خبر رکھو - دوسری عبارت کو قاآنی نے اس جملے سے شروع کیا ہے ''خرج بہ اندازۂ دخل باید کرد''- اس کے بعد وہ کہتا ہے ''نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم''- یہ دوسرا جملہ اس نے مقتضائے مقام کے موافق نہیں ، بلکہ اپنی حالت کے موافق لکھا ہے ، کیونکہ سنا گیا ہے کہ وہ اکثر جشن و عید وغیرہ کے موقعوں پر دخلِ موہوم یعنی قصائد کے صلے کی توقع پر قرض لے کر خرچ کر لیا کرتا تھا ، ورنہ مقتضائے مقام یہ ہونا چاہیے تھا ''نہ آنکہ دخل اندک باشد و خرج بسیار'' یا ''نہ آنکہ دخل پنج باشد و خرج دہ'' یا اور اسی مضمون کا

کوئی جملہ ہوتا ، کیونکہ آمدنی کے موافق خرچ کرنے کا مفہوم مخالف یہی مضمون ہو سکتا ہے - اس کے سوا وہ مضمون فی نفسہ صحیح بھی نہیں ہے ، کیونکہ دخلِ موہوم کی امید پر خرچ کرنا خاص خاص صورتوں کے سوا کسی کے نزدیک مذموم نہیں ہے - تمام تاجر اور کاشتکار اور مدبرانِ ملک دخلِ موہوم ہی کے بھروسے پر لکھو کھا روپے خرچ کرتے ہیں - پھر ایسے خرچ کو جو دخلِ موہوم کی امید پر کیا جائے ، موہوم یا معدوم گھوڑے پر سوار ہونے سے کچھ مناسبت نہیں معلوم ہوتی - معدوم گھوڑے پر بے شک کوئی سوار نہیں ہو سکتا ، لیکن دخلِ موہوم کی امید پر ، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ، ہزاروں آدمی خرچ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں -

گلستان

خشم بیش از حد گرفتن وحشت آرد و لطفِ بے وقت ہیبت ببرد - نہ چنداں درشتی کن کہ از تو سیر گردند و نہ چنداں نرمی کہ بر تو دلیر -

ابیات

درشتی و نرمی بہم در بہ ست
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ ست

درشتی نہ گیرد خردمند پیش
نہ سستی کہ زائل کند قدرِ خویش

نظم

جوانے با پدر گفت اے خرد مند !
مرا تعلیم کن پیرانہ یک پند

بگفتا نیک مردی کن ، نہ چنداں
کہ گردد چیرہ گرگِ تیز دنداں

پریشان

کسانیکہ ظرافت و شوخی بسیار کنند یا بغایت رقیق القلب و وسیع الخُلق باشند سرداری و سالاریِ لشکر را نشایند ۔ چہ این صفات موجبِ جسارتِ لشکریاں شود و گاہ باشد کہ ہر چہ گوید بہ ظرافت و شوخی حمل کنند ۔ و نیز اندک مہربانی و وسعتِ خُلق لازم ست کہ لشکریاں را بیمِ خستن و بستن نباشد ۔ دور نیست کہ از بیمِ چشم و گوش حقوقِ نعمتِ پادشاہ فراموش کنند و در مخالفت ہم زبان شوند و در وقتِ کار سستی کنند تا کار فاسد شود ۔

مثنوی

کسے را کہ شد حکمراں بر سپاہ
دو خصلت ہمے داشت باید نگاہ

عتابے نہاں ، اندرو صد خطاب
خطابے نہاں ، اندرو صد عتاب

بہر نوش او نیشہا جاں گداز
بہر نیش او نوشہا دلنواز

بیک دست شمشیرِ زہراب دار
بیک دست دریائے گوہر نثار

اس مثال میں ’گلستاں‘ اور ’پریشان‘ کے مضمون میں کسی قدر

فرق ہے ۔ 'گلستاں' میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں ہے اور 'پریشاں' میں لشکر کے افسروں اور سپہ سالاروں کی تخصیص ہے ، اس لیے پورا پورا مقابلہ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن چونکہ نفسِ مضمون متحد ہے ، اس واسطے کچھ کچھ پہلو مقابلے کے نکل سکتے ہیں ۔ شیخ کا بیان لفظاً و معناً قاآنی کے بیان سے بمراتب فائق تر ہے ۔ اول تو شیخ کے فقروں میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول ہے جو قاآنی کے فقروں میں نہیں ہے ۔ نثر میں ایسا تناسب ، بشرطیکہ معنیِ مقصود اور فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق نہ آئے ، پرلے درجے کا کمالِ انشا پردازی اور اعلیٰ سے اعلیٰ رتبے کی شاعری ہے ۔ شیخ کے چاروں فقروں میں الفاظِ متقابلہ ایسی خوبی سے واقع ہوئے ہیں کہ معنیِ مقصود کو ان سے اور زیادہ رونق ہو گئی ہے ۔ یعنی خشم اور لطف ، بیش از حد اور بے وقت ، وحشت اور ہیبت ، آرد اور ببرد ، درشتی اور نرمی ، از تو اور بر تو ، سیر اور دلیر ۔ پھر نظم کی پہلی بیت میں درشتی اور نرمی کو جو فِصّاد کی حالت سے تمثیل دی ہے ، وہ کیسی بلیغ ہے اور کس قدر مختصر لفظوں میں ادا کی گئی ہے ، اور دوسری بیت میں کتنا وسیع مضمون دو مصرعوں میں بیان کیا ہے ، یعنی یہ کہ درشتی کو اپنا شعار بنا لینا اور کبھی نرمی نہ برتنا جیسا کہ لفظ 'پیش گرفتن' سے مستفاد ہوتا ہے ، اچھا نہیں ہے ، کیونکہ عقل مند ایسا نہیں کرتے ۔ اور بالکل نرمی ہی نرمی برتنا اور کبھی درشتی نہ کرنا ، جیسا کہ 'سستی' کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے ، یہ بھی اچھا نہیں ہے کیونکہ اس سے انسان نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے ۔ پھر دوسری نظم میں صرف اتنی سی بات کو کہ نیکی بے محل نہیں کرنی چاہیے ، چار مصرعوں میں فرضی سوال و جواب کے طور پر نہایت لطف کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ خصوصاً 'چنداں' کا قافیہ متناسب اور ہم وزن لانے کے لیے کس مطلب کو کن لفظوں

میں ادا کیا ہے - قاآنی کی نثر میں بمقابلۂ شیخ کی نثر کے کوئی خوبی، جو قابلِ ذکر ہو، نہیں پائی جاتی، اور نظم میں بھی حقیقت اور معنی کی نسبت الفاظ کی چمک دمک زیادہ ہے - چونکہ دونوں عبارتوں میں فرق بیّن معلوم ہوتا ہے اس لیے 'پریشان' کی عبارت میں زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی -

اب ہم ان اضافی خوبیوں کا بیان چھوڑ کر 'گلستان' کے ذاتی محاسن کی طرف پھر متوجہ ہوتے ہیں - اس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی فارسی لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابلِ لحاظ ہے کہ فارسی اور اردو کی تحریر و تقریر میں جس قدر 'گلستان' کے جملے اور اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں، اور کسی کتاب کے نہیں دیکھے گئے - ان میں سے کسی قدر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

۱ - ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہُنر ست -

۲ - ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت -

۳ - حاجتِ مشاطہ نیست روے دلآرام را -

۴ - ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر -

۵ - ہر کہ دست از جاں بشوید ہرچہ در دل دارد بگوید -

۶ - دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند -

۷ - سرِ چشمہ شاید گرفتن بمیل
چو پُر شد نشاید گزشتن بہ پیل

۸ - پرتوِ نیکاں نگیرد ہر کہ بنیادش بدست -

۹ - افعی را کشتن و بچہ‌اش را نگاہ داشتن کارِ خردمنداں نیست -

۱۰ - پسرِ نوح با بداں بنشست، خاندانِ نبوتش گم شد -

۱۱ - دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد -

۱۲ - عاقبت گرگ زادہ گرگ شود -

۱۳ - در باغ لاله روید و در شوره بوم خس -

۱۴ - تونگری به دل ست نه بمال و بزرگی بعقل ست نه به سال -

۱۵ - دشمن چه کند چو مهربان باشد دوست -

۱۶ - حسود را چه کنم کو ز خود برنج درست -

۱۷ - قدرِ عافیت کسے داند که به مصیبتے گرفتار آید -

۱۸ - آنانکه غنی تر اند محتاج تر اند -

۱۹ - چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

۲۰ - دامن از کجا آرم که جامه ندارم -

۲۱ - گاہے به سلامے برنجند و گاہے به دشنامے خلعت دہند -

۲۲ - ہر کجا چشمۀ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

۲۳ - راستی موجبِ رضاے خدا ست
کس ندیدم که گم شد از رہِ راست

۲۴ - آں را که حساب پاک ست ، از محاسبه چه باک -

۲۵ - تو پاک باش برادر ، مدار از کس باک
زنند جامۀ ناپاک گاذراں بر سنگ

۲۶ - تا تریاق از عراق آورده شود مارگزیده مرده شود -

۲۷ - به دریا در منافع بے شمار ست
وگر خواہی سلامت بر کنار ست

۲۸ - دوست آں باشد که گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

۲۹ - درِ میر و وزیر و سلطاں را
بے وسیلت مگرد پیراہن

سگ و درباں چو یافتند غریب
ایں گریباں گرفت و آں دامن

۳۰ - خدائے راست مسلّم بزرگی و الطاف
کہ جرم بیند و ناں برقرار میدارد

۳۱ - بنیادِ ظلم اول در جہاں اندک بود ، ہر کہ آمد برآں
مزید کرد تابدیں غایت رسید -

۳۲ - ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد
ساعدِ سیمینِ خود را رنجہ کرد

۳۳ - چو کردی با کلوخ انداز پیکار
سرِ خود را بنادانی شکستی
چوسنگ انداختی بر روے دشمن
حذر کن کاندر آماجش نشستی

۳۴ - کس نیاموخت علمِ تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

۳۵ - دریاب کنوں کہ نعمتت ہست بدست
کایں دولت و ملک میرود دست بدست

۳۶ - گر وزیر از خدا بہ ترسیدے
ہم چناں کز ملِک ملَک بودے

۳۷ - بر گردنِ او بماند و بر ما گذشت -

۳۸ - اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت ''اینک ماہ و پرویں''

۳۹ - جہاندیدہ بسیار گوید دروغ -

۴۰ - چو کارے بے فضولِ من بر آید
مرا در وے سخن گفتن نشاید

۴۱ - اگر روزی بدانش بر فزودے
ز ناداں تنگ تر روزی نبودے
۴۲ - محتسب را درونِ خانہ چہ کار -
۴۳ - ہر کہ عیبِ دگراں پیشِ تو آورد و شمرد
بے گماں عیبِ تو پیشِ دگراں خواہد برد
۴۴ - یار شاطرم نہ بارِ خاطر -
۴۵ - چو از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را
۴۶ - من آنم کہ من دانم -
۴۷ - گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینیم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینیم
۴۸ - فہمِ سخن گر نکند مستمع
قوتِ طبع از متکلّم مجوے
۴۹ - خانۂ دوستاں بروب و درِ دشمناں مکوب -
۵۰ - درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار -
۵۱ - نیک باشی و بدت گوید خلق
بہ کہ بد باشی و نیکت گویند
۵۲ - اگر دنیا نباشد درد مندم
وگر باشد بمہرش پائے بندم
۵۳ - درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست -
۵۴ - پائے در زنجیر پیشِ دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں
۵۵ - زنِ بد در سرائے مردِ نکو
ہمدریں عالم ست دوزخ او
۵۶ - کوفتہ را نانِ تہی کوفتہ است -

۵۷ - او خویشتن گم است کرا رہبری کند -

۵۸ - باطل ست آنچہ مُدعی گوید -

۵۹ - مرد باید کہ گیرد اندر گوش
ور نوشتہ ست پند بر دیوار

۶۰ - خاک شو پیش از آنکہ خاک شوی -

۶۱ - اگر خاکی نباشد آدمی نیست -

۶۲ - ہمرہ اگر شتاب کند ہمرہِ تو نیست -

۶۳ - خوے بد در طبیعتے کہ نشست
نرود جز بوقتِ مرگ از دست

۶۴ - حقّا کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بہ پائمردیٔ ہمسایہ در بہشت

۶۵ - خوردن برائے زیستن و ذکر کردن ست
تو معتقد کہ زیستن از بہرِ خوردن ست ؟

۶۶ - نہ چندان بخور کز دہانت بر آید
نہ چندانکہ از ضعف جانت بر آید

۶۷ - عطاے او بہ لقاے او بخشیدم -

۶۸ - ہر کہ نان از عملِ خویش خورد
منّتِ حاتمِ طائی نہ برد

۶۹ - گربۂ مسکیں اگر پر داشتے
تخمِ کنجشک از جہاں برداشتے

۷۰ - مور ہماں بہ کہ نباشد پرش -

۷۱ - گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

۷۲ - مُنعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست -

۷۳ - شاہد آنجا کہ رود عزت و حرمت بیند
ور برانند بقہرش پدر و مادرِ خویش

۷۴ - بہ از روے زیبا ست آواز خوش
کہ ایں حظِ نفس ست و آں قوتِ روح

۷۵ - رزق ہر چند بے گماں برسد
شرطِ عقل ست جستن از در ہا

۷۶ - بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند -

۷۷ - مورچگاں را چو بود اتفاق
شیرِ ژیاں را بدرانند پوست

۷۸ - صیاد نہ ہر بار شکارے بہ برد
باشد کہ یکے روز پلنگش بدرد

۷۹ - گاہ باشد کہ کودکے ناداں
بغلط بر ہدف زند تیرے

۸۰ - گردنِ بے طمع بلند بود -

۸۱ - ایں شکمِ بے ہنرِ پیچ پیچ
صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

۸۲ - یکے نقصانِ مایہ و دوم شماتتِ ہمسایہ -

۸۳ - اگر از ہر دو جانب جاہلانند
اگر زنجیر باشد بگسلانند

۸۴ - مرا بخیرِ تو امید نیست ، بد مرساں -

۸۵ - تو بر اوجِ فلک چہ دانی چیست
چوں ندانی کہ در سراے تو کیست

۸۶ - گر تو قرآں بدیں نمط خوانی
ببری رونقِ مسلمانی

۸۷ - چشم بد اندیش که بر کنده باد
عیب نماید ہنرش در نظر
۸۸ - نکوئی با بداں کردن چناں ست
که بد کردن بجائے نیک مرداں
۸۹ - سرِ ما نداری سرِ خویش گیر -
۹۰ - ناز براں کن که خریدارِ تست -
۹۱ - خطاے بزرگاں گرفتن خطاست -
۹۲ - چوں مُخبّط شد اعتدالِ مزاج
نه عزیمت اثر کند نه علاج
۹۳ - زنِ جواں را اگر تیرے در پہلو نشیند به که پیرے -
۹۴ - تو بجائے پدر چه کردی خیر
تا ہماں چشم داری از پسرت
۹۵ - اسپِ تازی دو تگ رود بشتاب
اشتر آہسته میرود شب و روز
۹۶ - خرِّ عیسیٰ اگر بمکّه رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد
۹۷ - میراثِ پدر خواہی علمِ پدر آموز -
۹۸ - اگر صد عیب دارد مردِ درویش
رفیقانش یکے از صد ندانند
وگر یک نا پسند آید ز سلطاں
ز اقلیمے به اقلیمے رسانند
۹۹ - ہر که در خُردیش ادب نکنند
در بزرگی صلاح ازو برخاست
۱۰۰ - ہر آں طفل کو جورِ آموزگار
نه بیند ، جفا بیند از روزگار

۱۰۱ - جورِ اُستاد بہ ز مہرِ پدر -
۱۰۲ - چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن -
۱۰۳ - کریماں را بہ دست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست
۱۰۴ - پراگندہ روزی پراگندہ دل
خداوندِ روزی بحق مشتغل
۱۰۵ - سگے را گر کلوخے بر سر آید
ز شادی بر جہد کایں استخوان ست
وگر نعشے دو کس بردوش گیرند
لئیم‌الطبع پندارد کہ خوان ست
۱۰۶ - ہر جا کہ گل ست خارست -
۱۰۷ - منّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنم
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت
۱۰۸ - نہ محقّق بود نہ دانشمند
چار پائے برو کتابے چند
۱۰۹ - پیشِ دیوار آنچہ گوئی ہوشدار
تا نباشد در پسِ دیوار گوش
۱۱۰ - ہمہ کس را عقلِ خود بہ کمال نماید و فرزندِ خود بجمال -
۱۱۱ - گر ازبسیطِ زمین عقل منعدم گردد
بخود گماں نبرد ہیچ کس کہ نادانم
۱۱۲ - کہ خبثِ نفس نگردد بہ سالہا معلوم -
۱۱۳ - درشتی و نرمی بہم در بہ ست
چو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ ست
۱۱۴ - مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید -
۱۱۵ - اندک اندک بہم شود بسیار -

۱۱۶ - که بسیار خوار است بسیار خوار -
۱۱۷ - بر رسولاں بلاغ باشد و بس -
۱۱۸ - کہن جامۂ خویش آراستن
به از جامۂ عاریت خواستن

یہ تمام مقولے، جو نقل کیے گئے ہیں ، ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو تحریر اور تقریر دونوں میں استعمال کیے جاتے ہیں ؛ مگر تقریباً اسی قدر اور فقرے اور اشعار گلستاں میں ایسے بھی ہیں جو محض تحریروں میں برتے جاتے ہیں ، وہ یہاں نقل نہیں کیے گئے - یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ دنیا میں جہاں گلستاں اور بوستاں شائع ہوئی ہیں ، وہاں زیادہ تر ان کا استعمال کم عمر اور بے استعداد لڑکوں کی تعلیم و تعلّم میں پایا جاتا ہے اور اس لیے چھ سو برس سے شیخ کے یہ دونوں کارنامے برابر بازیچۂ طفلاں اور دستخوشِ کودکاں رہے ہیں - ظاہر ہے کہ جس سنّ و سال کے لڑکوں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کی استعداد اور سمجھ اس قابل نہیں ہوتی کہ شیخ کی فصاحت و بلاغت کا ، جو کہ اس نے ان کتابوں میں برتی ہے ، کچھ بھی اندازہ کر سکیں - لیکن چونکہ بچوں کا حافظہ عمدہ ہوتا ہے اس لیے کچھ کچھ فقرے یا اشعار ان کو یاد رہ جاتے ہیں - پس جس قدر گلستاں اور بوستاں کے فقرے اور اشعار بول چال میں ضرب المثل ہو گئے ہیں ، ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو لوگوں کو بچپن سے نوکِ زباں ہوتے ہیں اور جن کے مضمون سے وہ باوجود صغرِ سن کے لذّت یاب ہو چکے ہیں - ورنہ اگر یہ کتابیں بھی شیکسپئر پلیز کی طرح ایشیا کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے مطالعے میں رہتیں اور عورت اور مرد اور بوڑھے اور جوان سب لوگ ان کو دیکھا کرتے تو میں امید کرتا ہوں کہ گلستان کا ایک بڑا حصہ اور اس سے کسی قدر کم بوستان کے

اشعار جمہور کی زبان پر اسی طرح جاری ہو جاتے جیسے مذکورہ بالا فقرے اور اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں ، کیونکہ ان دونوں کتابوں میں شیخ کا بیان اس قدر عام طبائع کے مناسب اور ہر فرقے اور ہر گروہ کی ضرورت اور مذاق اور اغراض کے موافق واقع ہوا ہے کہ ہر فقرے اور ہر شعر میں ضرب المثل ہونے کی قابلیت پائی جاتی ہے - ہمیشہ وہ اقوال ضرب المثل بنتے ہیں جن کا مضمون عام لوگوں کے حسبِ حال ہو - الفاظ سیدھے اور صاف ہوں اور اندازِ بیان میں کسی قدر لطافت پائی جائے - سو یہ خاصیّت شیخ کے کلام میں عموماً اور گلستان اور بوستان میں خصوصاً پائی جاتی ہے -

اب ہم گلستان کے متعلق بحث ملتوی کر کے کسی قدر بوستان کا حال لکھتے ہیں - یہ کتاب بھی تقریباً اسی قدر مقبول ہوئی ہے جس قدر گلستان ، اور اس کی تعلیم بھی اکثر ملکوں میں اسی طرح جاری ہے جیسے گلستان کی - مثنوی میں فردوسی کو عموماً تمام شعرا پر ترجیح دی گئی ہے اور حقیقت میں رزم کا بیان باوجود نہایت سادگی اور صفائی کے جیسا مؤثر اور پُرجوش اس کے قلم سے تراوش کرتا ہے ، ایسا اور کسی سے بن نہیں آیا - لیکن مثنوی میں مطلقاً فردوسی کو سب سے افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے - ہمارے نزدیک جس طرح طعن و ضرب اور جنگ و حرب کا بیان فردوسی پر ختم ہے ، اسی طرح اخلاق ، نصیحت و پند ، عشق و جوانی ، ظرافت و مزاح ، زہد و ریا وغیرہ کا بیان شیخ پر ختم ہے - 'شاہنامہ' میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑتا ہے ، وہاں اس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی - یہی سبب ہے کہ اس کی عشقیہ مثنوی 'یوسف و زلیخا' اس قدر مقبول نہیں ہوئی جس قدر 'شاہنامہ' مقبول ہوا ہے - شیخ نے بوستان میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے میرے کلام کی بہت سی

تعریف کرنے کے بعد مجھ پر یہ اعتراض کیا کہ اس کو بہادری اور رزم کا بیان کرنا ویسا نہیں آتا جیسا اور لوگوں کو آتا ہے۔ یہ قصہ نقل کر کے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ "ہم کو لڑائی کا خیال ہی نہیں ہے ورنہ ہم کسی بیان سے عاجز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اپنی تیغِ زباں کو میان سے نکال کر تمام دفترِ شعر و سخن پر قلم پھیر دوں۔" اس کے بعد ایک حکایت شاطر صفاہانی کی جنگِ تاتار کے ذکر میں لکھی ہے جس سے اپنا رزمیہ بیان دکھانا مقصود ہے۔ اگرچہ شیخ کی شیریں زبانی اور فصاحت سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن 'شاہنامہ' کی نظم کے سامنے اس کا رنگ جمنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام محسوسات اور وجدانیات کے مرغوب و نامرغوب ہونے میں الف و عادت کو بڑا دخل ہے۔ مرچ جس قدر عام ہندوستانیوں کو عادتِ مستمرہ کی وجہ سے مرغوب ہے، اسی قدر اکثر غیر ممالک والوں کو خلافِ عادت ہونے کے سبب نامرغوب ہے۔ اکثر عطر ہم کو خوش گوار اور غیر ملک والوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح لطفِ شعر، جو کہ ایک وجدانی امر ہے، بغیرِ الف و عادت کے ہرگز محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً انیس و دبیر کے مرثیے جس پیرائے اور لباس میں مقبول ہوئے ہیں وہ پیرایہ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر مرثیہ مقبول ہونا مشکل ہے، یعنی ضرور ہے کہ کچھ بند تلوار اور کچھ گھوڑے کی تعریف میں لکھے جائیں، کچھ بند ایسے بھی ہوں جن سے خود مرثیہ گو کی تعلّی اور فوقیت اوروں پر ظاہر ہو، یہ بھی ضرور ہے کہ مرثیہ مسدّس میں لکھا جائے اور مسدّس انہیں بحروں میں سے کسی بحر میں ہو جو انیس و دبیر نے اختیار کی ہیں۔ پس جن خصوصیتوں کے ساتھ شاہنامہ مقبول ہوا ہے ان کے بغیر کسی کی رزمیہ

نظم مقبول نہیں ہو سکتی - ضرور ہے کہ خالص فارسی میں ، جو عربی الفاظ سے پاک ہو، رزم لکھی جائے اور بے شمار الفاظ ، جن میں فردوسی نے تصرّف کیا ہے اور قیاسِ لغوی کے خلاف استعمال کیے ہیں ، کبھی کبھی قصداً اسی طرح برتے جائیں ، جیسے شاہنامہ میں برتے گئے ہیں اور بے انتہا حشو و زوائد ، جن سے شاہنامہ بھرا ہوا ہے ، اشعار میں بے تکلف داخل کیے جائیں - پس شیخ کی رزمیّہ حکایت ، جو فردوسی کے شاہنامے سے میل نہیں کھاتی ، اس کا یہی سبب ہے کہ شیخ نے ان باتوں میں سے کسی بات کا التزام نہیں کیا - فردوسی نے بھی یہی گُر اختیار کیا تھا ، جس سے اس کی مثنوی مقبول ہوئی - دقیقی نے جو فردوسی سے پہلے ہزار بیتوں میں گشتاسپ اور ارجاسپ کی داستان نظم کی تھی ، وہ سب کو پسند آ چکی تھی - جب دقیقی وہ داستان لکھ کر دفعةً مر گیا اور فردوسی کی نوبت آئی تو اس نے بھی وہی روش اختیار کی جو دقیقی نے اختیار کی تھی - چنانچہ دقیقی کی لکھی ہوئی داستان عام شاہناموں میں موجود ہے - دونوں کے کلام میں کوئی نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا ، یہاں تک کہ جو لوگ اس حال سے واقف نہیں ہیں ، وہ اس کو بھی فردوسی ہی کا کلام سمجھتے ہیں -

فارسی میں چار مثنویاں ہیں جو شہرت اور قبولیت میں تقریباً متساوی الاقدام ہیں - شاہنامہ ، سکندر نامہ ، مثنوی معنوی اور بوستاں - شاہنامہ اور مثنوی معنوی کو سکندر نامہ اور بوستاں سے وہ نسبت ہے جو ایک کامل خوش نویس کی بے ساختہ مشق کو اس کے بنائے ہوئے اور مرتّب کیے ہوئے قطعے سے ہوتی ہے - قطعہ اگرچہ رخ اور کرسی اور حروف کی نشست اور تقسیم وغیرہ کے لحاظ سے مشق کی نسبت بے عیب ہوتا ہے اور اس کے اجزاء میں پست و بلند کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور تمام حروف تقریباً ہموار اور یکساں

معلوم ہوتے ہیں ، مگر مشق میں بہت سی کششیں اور دوائر وغیرہ بےساختہ اس کے قلم سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اگر خوش نویس خود کوشش کرے تو قطعے میں شاید ویسی کششیں اور دائرے نہ لکھ سکے - یہی سبب ہے کہ خوش نویس لوگ اگلے استادوں کی مشق کو ان کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں - فردوسی اور مولانا روم نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامی اور سعدی کے الفاظ کی زیادہ تنقیح و تہذیب اور کانٹ چھانٹ نہیں کی ، مگر باوجود اس کے صدہا مقامات ان سے ایسے حسنِ خوبی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ تکلّف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ہو سکتے -

بوستان اور سکندر نامہ صرف اس لحاظ سے کہ دونوں کمال تنقیح و تہذیب اور زحمتِ فکر و نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور دونوں میں صنعتِ شاعری کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے ، شاید ایک دوسرے سے مشابہ ہوں - لیکن دونوں کے اندازِ بیان میں بہت بڑا تفاوت ہے - سکندرنامہ میں شاعرانہ مبالغہ ، زورِ بیان ، شوکتِ الفاظ ، طرفگیٔ استعارات ، تنوعِ تمثیلات ، ایک ایک مطلب نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا ، ہر داستان کو ایک بڑی دھوم دھام کی تمہید کے ساتھ شروع کرنا اور اسی طرح کی اور شاندار باتیں پائی جاتی ہیں - برخلاف اس کے بوستاں میں نہایت سادگی ، الفاظ کی نرمی اور گھلاوٹ ، ترکیبوں کا سلجھاؤ ، بیان کی صفائی ، عبارت کی دلنشینی ، خیالات کی ہمواری ، مبالغے میں اعتدال ، ماخذ میں سہولیت ، حسنِ ترتیب ، لطفِ ادا ، تمثیلات کی برجستگی ، استعارات کی لطافت ، کنایات کی شوخی ، باوجود صنعتِ شاعری کے نہایت بے تکلّفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ہے -

مثلاً اس مطلب کو کہ زمین میں خدا کی بے انتہا مخلوق دبی

ہوئی ہے ، مولانا نظامی سکندر نامہ میں اس طرح ادا کرتے ہیں :

فلک بر بلندی ، زمیں در مغاک
یکے طشتِ خوں شد، یکے طشتِ خاک
نبشتہ بریں ہر دو آلودہ طشت
ز خونِ سیاوش بسے سرنوشت
زمیں گر بضاعت بروں آورد
ہمہ خاک در زیرِ خوں آورد

یہی مطلب سکندر نامہ میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے :

کہ داند کہ ایں دخمۂ دام و دد
چہ تاریخ ہا دارد از نیک و بد
چہ نیرنگ باںخرداں ساختہ ست
چہ گردن کشاں را سر انداختہ ست

شیخ نے اس مطلب کو بوستان میں یوں بیان کیا ہے :

زدم تیشہ یک روز بر تلِّ خاک
بگوش آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار گر مردی آہستہ تر
کہ چشم و بنا گوش و روی ست و سر

یہی مطلب بوستاں میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے :

دریں باغ سروے نیامد بلند
کہ بادِ اجل بیخش از بن نکند

عجب نیست بر خاک اگر گُل شگفت
کہ چندیں گُل اندام در خاک خفت

قناعت کی ترغیب سکندر نامہ میں اس طرح دی ہے :

تو نیز ار تہی بارِ گردن ز دوش
ز گردن کشاں بر نیاری خروش

چو دریا بہ سرمایۂ خویش باش
ہم از بود خود سود خود برتراش

بہ مہمانیٔ خویش تا روزِ مرگ
درختے شو از خویشتن سازِ برگ

چو پیلہ ز برگِ کساں خورد گاز
ہمہ تن شد انگشت و قے کرد باز

بوستاں میں یہی مطلب اس طرح ادا ہوا ہے :

شنیدی کہ در روزگارِ قدیم
شدے سنگ بر دستِ ابدال سیم

نہ پنداری ایں قول معقول نیست
چو قانع شدی سیم و سنگت یکے ست

چو طفل اندروں دارد از حرص پاک
چہ مشتِ زرش پیش و چہ مشتِ خاک

خبر دہ بدرویش سلطاں پرست
کہ سلطاں ز درویش مسکیں ترست

گدا را کند یک درم سیم سیر
فریدوں بملکِ عجم نیم سیر

گدائے کہ بر خاطرش بند نیست
بہ از پادشاہے کہ خورسند نیست
بخسپند خوش روستائی و جُفت
بذوقے کہ سلطاں در ایواں نخفت

مآل اندیشی اور پیش بینی کی نصیحت سکندر نامہ میں اس طرح کی گئی ہے :

میفگن گَوَل گرچہ عار آیدت
کہ ہنگامِ سرما بکار آیدت
خرے بر کریوہ ز سختی بمرد
کہ از کاہلی جُلّ با خود نہ برد

یہی مضمون بوستان میں اس طرح ادا کیا گیا ہے :

بہ دختر چہ خوش گفت بانوی دہ
کہ روزِ نوا برگ سختی بنہ
ہمہ وقت پُر دار مشک و سبوی
کہ پیوستہ در دہ رواں نیست جوی

سکندر نامہ[1] میں یہ مضمون کہ دشمن کو ناچیز نہ سمجھنا چاہیے ، اس طرح ادا کیا گیا ہے :

جہاں آں کسے راست کو در نبرد
پۓ مرد نگزاشت بر ہیچ مرد

---

۱ - سکندر نامہ اور بوستان کے یہ دونوں شعر بعد کے ایڈیشنوں میں نہیں ہیں - (اسماعیل پانی پتی)

گلستان میں یہی مضمون اس طرح بیان کیا ہے :

دانی کہ چہ گفت زال با رستم گُرد
دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد

سکندر نامہ میں عہدِ شباب پر تحسّر اس طرح کیا گیا ہے :

جوانی شد و زندگانی نماند
جہاں گو مماں چوں جوانی نماند

جوانی بود خوبیٔ آدمی
چو خوبی رود کے بود خرّمی

چوپے سست و بوسیدہ شد استخواں
دگر قصّۂ خوبروئی مخواں

غرورِ جوانی چو از سرگزشت
ز گستاخ کاری فرو شوے دست

بہی چہرۂ باغ چنداں بود
کہ شمشاد با لالہ خنداں بود

چو بادِ خزانی در افتد بباغ
زمانہ دہد جاے بلبل بہ زاغ

بود برگ ریزاں ز شاخِ بلند
دل باغباں زاں شود دردمند

ریاحیں ز بستاں شود نا پدید
درِ باغ را کس نہ جوید کلید

بنال اے کہن بلبلِ سال خورد
کہ رخسارۂ سرخِ گُل گشت زرد

دوتا شد سہی سرو آراستہ
کدیور شد از باغ برخاستہ

چو تاریخ پنجہ در آمد بہ سال
دگرگونہ شد بر شتابندہ حال

سر از بارِ سنگی در آمد بسنگ
جمازہ بہ تنگ آمد از راہِ تنگ

فروماند دستم ز مے خواستن
گراں گشت پایم ز برخاستن

تنم گونۂ لاجوردی گرفت
گُلم سُرخی انداخت زردی گرفت

ہیونِ ردندہ ز رہ ماندہ باز
ببالیں گہ آمد سرم را نیاز

ہماں بورِ چوگانیِ باد پاے
بصد زخمِ چوگاں نہ جنبد ز جاے

طرب را بہ میخانہ گم شد کلید
نشانِ پشیمانی آمد پدید

بوستاں میں یہی مضمون ایک حکایت کے ضمن میں اس طرح ادا کیا گیا ہے:

چو بادِ صبا بر گلستاں وزد
چمیدن درختِ جواں را سزد

چمد تا جوان ست و سرسبز خید
شکستہ شود چوں بہ زردی رسید

بهاراں کہ باد آورد بید مشک
بریزد درختِ کہن برگ خشک

نہ زیبد مرا با جواناں چمید
کہ بر عارضم صبحِ پیری دمید

بقید اندرم جرّہ بازے کہ بود
دمادم سرِ رشتہ خواہد ربود

شمار است نوبت بریں خوان نشست
کہ ما از تنعم بشستیم دست

چو بر سر نشست از بزرگی غبار
دگر چشمِ عیشِ جوانی مدار

مرا برف بارید بر پّرِ زاغ
نشاید چو بلبل تماشاے باغ

کند جلوہ طاؤس صاحب جمال
چہ میخواہی از بازِ برکندہ بال

مرا غلّہ نیک آمد اندر دَرو
شما را کنوں میدمد سبزہ نو

گلستانِ ما را طراوت گزشت
کہ گل دستہ بندد چو پژمردہ گشت

مرا تکیہ جانِ پدر بر عصا ست
دگر تکیہ بر زندگانی خطا ست

مسلّم جوان راست بر پاے جست
کہ پیران برند استعانت بدست

گلِ سرخ رویم نگر زرِّ ناب
فرو رفت چوں زرد شد آفتاب

ہوس پختن از کودکِ ناتمام
چناں زشت نبود کہ از پیر خام

مرا مے بباید چو طفلاں گریست
ز شرمِ گناہاں ، نہ طفلانہ زیست

نکو گفت لقماں کہ نا زیستن
بہ از سالہا بر خطا زیستن

ہم از بامداداں درِ کلبہ بست
بہ از سود و سرمایہ دادن ز دست

جواں تا رساند سیاہی بہ نور
برد پیرِ مسکیں سپیدی بہ نور

مذکورہ بالا مثالوں کے ملاحظے سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ کے خیالات ہمیشہ سہل الماخذ ہوتے ہیں ۔ وہ معنیِ مقصود کو ایسی تمثیلوں میں بیان کرتا ہے جو ہمیشہ خاص و عام کے مشاہدے میں آتی ہیں ، بخلاف مولانا نظامی کے کہ ان کے خیالات اور تمثیلات اکثر غرابت اور ندرت سے خالی نہیں ہوتیں ۔

شیخ نے جو شاطرِ صفاہانی کی حکایت میں اپنا رزمیہ بیان دکھایا ہے ، وہ اگرچہ بے تکلفی اور سادگی میں فردوسی کے بیان سے نہیں ملتا لیکن مولانا نظامی کی رزم سے ، جس میں سادگی کی نسبت شاعری کا زیادہ لطف ہے ، بہت مشابہت رکھتا ہے ۔ چند شعر اس حکایت کے اور ان کے ہم مضمون اشعار 'سکندر نامہ' کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں :

بوستاں

دو لشکر بہم بر زدند از کمیں
تو گفتی زدند آسماں بر زمیں
ز باریدنِ تیر ہمچوں تگرگ
بہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ
بصیدِ ہزبرانِ پرخاش ساز
کمندِ اژدہائے دہن کردہ باز
زمیں آسماں شد ز گردِ کبود
چو انجم در و برق شمشیر و خود
چو ابر اسپِ تازی بر انگیختم
چو باراں پلارک فرو ریختم

سکندر نامہ

دو لشکر چوں مور و ملخ تاختند
نبردِ جہاں در جہاں ساختند
بشمشیرِ پولاد و تیرِ خدنگ
گزرگاہ بر مور کردند تنگ
کمند اژدہائے مسلسل شکنج
دہن باز کردہ بتاراجِ گنج
زمیں کو بساطے بُد آراستہ
غبارے شد از جائے برخاستہ
بر انگیخت رزمے چو بارندہ میغ
تگرگش ز پیکان و باراں ز تیغ

مگر حق یہ ہے کہ ایک دو حکایت کے ملا دینے سے مساوات اور برابری کا حکم نہیں لگایا جا سکتا - رزم میں فردوسی اپنی جگہ اور نظامی اپنی جگہ فی الحقیقت اپنا مثل نہیں رکھتے -

شیخ علی حزیں نے ، جس کو ہندوستان میں خاتم الشعرأ سمجھتے ہیں ، بیس بائیس صفحے کی ایک مثنوی ، جس کا نام 'خرابات' ہے ، 'بوستاں' کی طرز میں لکھی ہے ، اور اپنی عادت کے موافق اس پر بہت کچھ افتخار کیا ہے - چنانچہ مثنوی کے خاتمے میں فرماتے ہیں :

سخن سنج اگر ہست ہشیار مغز
کند قوتِ جاں ایں گُہرہاے نغز

ازیں نامہ گردوں پُر آوازہ شد
روانِ سخن گستراں تازہ شد

نواے کہ ایں خامہ بنیاد کرد
دلِ طوسی و رودکی شاد کرد

بگوشِ نظامی اگر میرسید
سرودے ازیں خسروانی نشید

بہ تعظیم من رخ نہادے بخاک
کہ آحسنتِ اے نیّرِ تابناک

وگر سعدیِ شہد پرور ادا
شنیدے ز صورِ نئے من نوا

سماعش ز سر عقل بردے و ہوش
زباں مہر کردے شدے جملہ گوش

معلوم ہوتا ہے کہ علی حزیں نے اپنے نزدیک اس مثنوی میں

بوستاں کے تتبّع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور وہ اس کو اپنے لیے ایک سرمایۂ نازش سمجھتا تھا ۔ سوانح عمری میں اسی مثنوی کی نسبت لکھتا ہے کہ ''بسیارے از مطالبِ عالیہ و سخنانِ دلپذیر دراں کتاب بسلکِ نظم در آمد۔'' مگر دونوں کتابوں یعنی بوستاں اور خرابات کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک شکل کی ہیں : ایک جان دار ، دوسری بے جان ۔ لفظ اچھے ، بیان اچھا ، مطالبہ عمدہ ، یہ سب کچھ سہی مگر شیخ کے بیان میں ایک چھپا ہوا جادو ہے جو بوستاں کو خرابات سے بالکل الگ کر دیتا ہے ۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے دونوں کا فرق بخوبی معلوم ہو سکتا ہے ۔ قحط کا بیان ایک جگہ بوستاں میں بھی کیا گیا ہے اور خرابات میں بھی اتفاق سے یہ مضمون نکل آیا ہے ۔ ہم دونوں کے اشعار اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور جو فرق دونوں کے طرزِ بیان اور طریقۂ ادا میں ہے اس کو بھی کسی قدر بیان کریں گے :

بوستاں

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

چناں آسماں بر زمیں شد بخیل
کہ لب تر نہ کردند زرع و نخیل

نجوشید سرچشمہ ہائے قدیم
نماند آب جز آبِ چشمِ یتیم

نبودے بجز آہِ بیوہ زنے
اگر برشدے دودے از روزنے

چو درویش بے برگ دیدم درخت
قوی بازواں سست و درماندہ سخت

نہ بر کوہ سبزی ، نہ در باغ شخ
ملخ بوستاں خورد و مردم ملخ

خرابات

شنیدم کہ در عہدِ بہرام گور
نمود از قضا قحط سالی ظہور

چو صحرائے محشر زمیں تف گرفت
بہ دریوزۂ آسماں کف گرفت

سحابِ سیہ دل نشد مہرباں
بحالِ لبِ تشنۂ خاکیاں

بخیلی نمود ابر بر کائنات
بمہدِ زمیں سوخت طفلِ نبات

ز خشکی براندام خاکِ دو تُوہ
عُرُوقِ شجر شد چو رگہائے کوہ

ز تابِ فروزندہ مہرِ بلند
زمیں مجمر و دانہ بودش سپند

بطِ مے چو پستانِ بے شیر شد
ز خشکی چو پیکاں گلوگیر شد

شیخ سعدی نے پہلے ہی شعر کے دوسرے مصرع میں جس حسن و لطافت کے ساتھ قحط کی سختی کی تصویر کھینچی ہے ، اس سے بہتر کوئی اسلوبِ بیان خیال میں نہیں آتا ۔ قحط کی شرح ایک

کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتی جیسی اس ایک مصرع میں ہوئی ہے کہ ''یاراں فراموش کردند عشق۔'' سہل و ممتنع کا لفظ ، جو اکثر بولا جاتا ہے ، وہ اسی قسم کے بیان کو کہتے ہیں کہ بادی النظر میں نہایت سرسری معلوم ہو مگر وہی مطلب دوسری بار کسی سے ، بلکہ خود مصنف سے بھی ویسا بیان نہ ہو سکے ۔ اس بیان میں لطف یہ ہے کہ قحط کے بیان کے جتنے معمولی اسلوب ہیں ، یہ اسلوب ان سب سے علاحدہ ہے ۔ قحط کی سختی ہمیشہ اس طرح بیان کی جاتی ہے : ''ایسا قحط پڑا کہ روٹی جان سے زیادہ عزیز ہو گئی ، آدمی بھوک میں آدمیوں کو کھا گئے ، ماں باپ نے ایک ایک روٹی کے بدلے اولاد کو بیچ دیا ، لاکھوں جاندار بھوکے مر گئے۔'' غرضیکہ تمام بیان ایسے ہوتے ہیں جن سے غلّے کی گرانی ، پانی کی نایابی ، بھوک کی تکلیف اور اسی قسم کی باتیں سمجھی جائیں ۔ شیخ نے وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو سب سے نرالا اور سب سے بلیغ ہے ۔ اس اسلوب سے اس کو یہ جتانا مقصود ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق ایک ایسی چیز ہے جو کسی حالت میں فراموش نہیں ہوتی ، باوجود اس کے لوگ اس کو بھول گئے تھے اور یاراں کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ مصنف بھی اسی عشّاق کے جرگے میں سے تھا ۔ دوسرے شعر کا صرف یہ مطلب ہے کہ مینہ نہ برسا تھا ، مگر اس کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے ۔ تیسرے شعر میں پانی کا نایاب ہونا اور پھر یتیم کے آنسو کو اس سے مستثنیٰ کرنا ۔ چوتھے شعر میں کسی گھر کے روزن سے باورچی خانے کے دھوئیں کا نہ نکلنا اور پھر اس سے رانڈوں کی آہ کے دھوئیں کو مستثنیٰ کرنا ۔ پانچویں شعر میں درختوں کو بے برگی میں قحط زدہ درویشوں اور مسکینوں سے تشبیہ دینا اور قوی پہلوانوں کا بے بس اور عاجز ہو جانا ، یہ تمام اسلوب کس قدر لطیف اور

دلکش ہیں ۔ چھٹا شعر بلاغت اور حسنِ بیان میں تقریباً ویسا ہی اعلیٰ درجے کا ہے جیسا پہلا ۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے کوئی بات ایسی نہیں جو نیچر یا عادت کے خلاف ہو ۔ قحط میں عشق کے ولولوں کا نیست و نابود ہو جانا ، درختوں کا سرسبز نہ ہونا ، چشموں اور ندیوں کا خشک ہو جانا ، یتیموں کا رونا ، گھروں میں کھانا نہ پکنا ، بے وارث رانڈوں کے آہ و نالے ، درختوں کا بے برگ و بار اور غریبوں کا بے سر و سامان ہونا ، پہلوانوں اور زبردستوں کا درماندہ ہو جانا ، پہاڑ اور جنگل میں سبزہ اور ہریاول کا نہ رہنا ، ٹڈیوں کا باغ اور کھیتی کو اور آدمیوں کا ٹڈیوں کو کھانا ، یہ سب باتیں ایسی ہیں جو قحط کے زمانے میں اکثر و بیشتر ظہور میں آتی ہیں ۔

حزیں نے باوجودیکہ خرابات ، جو چند اوراق سے زیادہ نہیں ہے ، بوستاں سے پانچ سو برس بعد لکھی ہے ، اور جیسا کہ اس کے بیان سے مترشّح ہوتا ہے ، اپنی پوری طاقت شیخ کے تتبّع میں صرف کی ہے ، کوئی کرشمہ اس کی مثنوی میں ایسا نہیں پایا جاتا جس کو دیکھ کر جی بے اختیار پھڑک اٹھے ۔

پہلا شعر ہموار اور صاف ہے ، اس میں کوئی خوبی قابلِ ذکر نہیں ۔ دوسرے شعر میں زمینِ تفتہ کو صحرائے محشر سے تشبیہ دینا تعریف الشئی بالمجہول کے قبیل سے ہے ، یعنی ایک ایسی تمثیل ہے جو اہلِ دنیا کی نظر میں قحط کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے ۔ صحرائے محشر اور تمام اعتقادیات خود تمثیل کی محتاج ہیں ، ان پر قیاس کرنے سے کسی شے کی حقیقت نہیں کھل سکتی ۔ تیسرا شعر بوستان کے اس شعر سے ماخوذ ہے جو ذوالنّون مصری اور مصر کے قحط کے بیان میں شیخ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے :

خبر شد بہ مدین پس از روز بیست
کہ ابرِ سیہ دل بر ایشاں گریست

مگر اتنا فرق ہے کہ شیخ نے ابر کے برسنے کو رونے سے تعبیر کیا ہے ، جس سے ترحّم اور برسنا دونوں باتیں ٹپکتی ہیں اور حزیں نے برسنے کو مہربان ہونے سے تعبیر کیا ہے ، جس سے دونوں معنی ویسے صاف نہیں نکلتے ۔ چوتھا شعر شیخ کے اس شعر سے ماخوذ ہے :

چناں آسماں بر زمیں شد بخیل
کہ لب تر نکردند زرع و نخیل

مگر شیخ کے بیان میں اتنا لطف زیادہ ہے کہ کھڑی کھیتی کا خشک ہو جانا زیادہ حسرت‌ناک ہے بہ نسبت اس کے کہ تخم زمین کے اندر ہی جل جائے ۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرع بہت عمدہ ہے مگر پہلا مصرع تکلّف سے خالی نہیں ۔ شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ زمین کی خشکی کے سبب درختوں کی رگیں پہاڑ کی رگوں کی طرح سوکھ گئی تھیں ، پس اندام اور دوُتوہ کے لفظ کو افادۂ معنی میں کچھ دخل نہیں ہے ۔ چھٹے شعر میں صرف یہ بیان ہے کہ آفتاب کی گرمی سے زمین انگیٹھی کی طرح جلتی تھی اور تخم ، جو اس پر ڈالا جاتا تھا ، وہ سپند کا حکم رکھتا تھا ۔ پس فروزندہ اور بلند جو دو صفتیں مہر کی واقع ہوئی ہیں ، انھوں نے کچھ فائدہ نہیں دیا ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ فروزندۂ مہر کہنے سے آفتاب کی گرمی کا زیادہ ثبوت ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ مہرِ بلند کہنے سے اس کی گرمی کا خیال کم ہو جاتا ہے اور ایسی دو متضاد صفتیں لانی بلاغت کے خلاف ہیں ۔ ساتویں شعر کا مضمون بالکل خلافِ عادت

اور خلافِ مقتضائے مقام ہے ۔ نہ قحط کا یہ خاصہ ہے کہ شراب کی صراحی کو خشک کر دے اور نہ صراحی کا خشک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قحط کی شدت ہو رہی ہے ۔

یہ جو کچھ ہم نے بطور محاکمے کے لکھا ہے اس سے خان آرزو کی طرح شیخ علی پر حرف گیری کرنی ہمارا مقصود نہیں ہے اور نہ بوستان کو خرابات سے افضل ثابت کرنا مدِّ نظر ہے ، کیونکہ نہ ہم شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور نہ بوستان کے افضل ہونے میں کسی کو شبہ ہے ، بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ کوئی شے فی نفسہ کیسی ہی بے عیب ہو ، جب وہ کسی ایسی شے کے مقابلے میں لائی جاتی ہے جو اس سے بہ مراتب افضل اور فائق ہو تو اس میں بیسیوں فروگزاشتیں اور قصور نظر آنے لگتے ہیں ۔ اگر خرابات بوستان کے جواب میں نہ ہوتی اور حسنِ اتفاق سے ایک مضمون کی حکایتیں دونوں مثنویوں میں نہ نکل آتیں تو حزیں کے بیان میں چون و چرا کرنے کا خیال بھی نہ آتا ، کیونکہ یہ باتیں تقریباً تمام شعرأ کے ہاں عامۃالورود ہیں ۔

اب ہم گلستان اور بوستان کی چند خاصیتیں ایسی بیان کرتے ہیں جو دونوں کتابوں میں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں اور جن کو ان کے مقبول ہونے میں بہت بڑا دخل ہے ۔ مثالوں کی جہاں ضرورت ہوگی ، کہیں صرف گلستان سے اور کہیں بوستان سے اور کہیں دونوں سے نقل کی جائیں گی ۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ان میں سرتاپا اخلاق اور تہذیبِ نفس کے مضامین مندرج ہیں ، مگر میرے نزدیک ان کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اخلاق اور مواعظ کو شیخؒ کے سوا کسی نے ایسی

خوبی اور لطافت کے ساتھ فارسی زبان میں بیان نہیں کیا - اخلاق میں بیسیوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اب تک موجود ہیں اور غالباً گلستان اور بوستان میں کوئی پند و نصیحت ایسی نہ ہوگی جو اوروں نے نہ لکھی ہو ، مگر کوئی کتاب ان دونوں کتابوں کے برابر مقبول نہیں ہوئی - اس سے ظاہر ہے کہ قبولِ عام کا مدار زیادہ تر حسنِ بیان اور لطفِ ادا پر ہے ، نہ کہ نفسِ مضامین پر - البتہ مضامین کو بھی شہرت اور مقبولیت میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے ، اسی لیے جو محاسن ان کتابوں کے ہم آگے لکھنا چاہتے ہیں وہ کسی قدر مضامین سے اور زیادہ تر حسنِ معنی اور اسلوبِ بیان سے متعلق ہوں گے -

۱ - سب سے زیادہ تعجب انگیز بات ان دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ جن باتوں میں مشرقی لٹریچر عموماً بدنام ہے وہ ان کتابوں میں اس قدر کم ہیں کہ چند مقامات مستثنیٰ کرنے کے بعد کوئی ایسی بات باقی نہیں رہتی جو زمانۂ حال کے مورل اور سوشل خیالات کے برخلاف ہو ، اور یہ امر ایسی پرانی کتابوں میں ، جن کے زمانۂ تصنیف کو ساڑھے چھ سو برس سے زیادہ گزر چکے ہیں ، کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے -

مثلاً مبالغہ اور اغراق ، جو مشرقی انشا کا خاصہ ہے ، ان کتابوں میں اتنا کم ہے جتنا ایران کے اور شعراء کے کلام میں سچ ، اور جہاں ہے وہاں نہایت لطیف اور بامزہ ہے اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں - مثلاً شیخ بوستان میں کہتا ہے :

میانِ دو کس دشمنی بود و جنگ
سر از کبر بر یک دگر چوں پلنگ

ز دیدار ہم تا بجدّے رساں
کہ بر ہر دو تنگ آمدے آسماں

دوسری بیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے ایسے بیزار تھے کہ جب کبھی راہ میں دو چار ہو جاتے تھے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رستے سے اُلٹے ہٹ جاتے تھے اور اُس وقت کمال نفرت سے ان کا یہ جی چاہتا تھا کہ آسمان ، جو سامنے حائل نظر آتا ہے ، اس کو توڑ کر نکل جائیں - یہ مبالغہ جیسا کہ بادی النظر میں بڑا معلوم ہوتا ہے ، فی الحقیقت ایسا نہیں ہے ، کیونکہ نفرت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کا کوئی اندازہ اور پیمانہ مقرر نہیں ہے - پس جس طرح ادنیٰ درجے کی نفرت یہ ہے کہ دو دشمن ایک مجلس میں اکٹھا ہونا پسند نہیں کرتے ، اسی طرح انتہا درجے کی نفرت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عالم میں رہنا پسند نہ کریں -

× شیخ[۱] اور دیگر شعرائے ایران کے مبالغے میں جو فرق ہے وہ ذیل کی مثال سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے - مولوی نظامی سکندر نامہ میں فرماتے ہیں :

سخن گرچہ با او زہازہ بود
نگفتن ہم از گفتنش بہ بود

یعنی بات کیسی ہی عمدہ ہو اس کا نہ کہنا ہی بہتر ہے - مقصود یہ ہے کہ خاموشی بہت اچھی چیز ہے - شیخ اسی باب میں یوں کہتا ہے :

---

۱ - یہاں سے ''زیادہ وقعت رکھتی ہیں'' تک کی عبارت موجودہ ایڈیشنوں میں نہیں ہے - اس زاید عبارت کے اول اور آخر میں نے کانٹی (×) کا نشان لگا دیا ہے - (اسماعیل پانی پتی)

کمال ست در نفسِ انساں سخن
تو خود را بگفتارِ ناقص مکن

مبالغہ مولانا اور شیخ دونوں کے شعروں میں موجود ہے۔ دونوں کو بسیار گوئی کی برائی بیان کرنی منظور تھی، سو اس کو بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ سرے سے بولنے ہی کو منع کر دیا، مگر مولانا کے بیان میں ایک نوع کا تحکّم اور ادّعائے محض پایا جاتا ہے، یعنی یہ کہ بات کیسی ہی عمدہ اور تحسین و آفرین کے قابل ہو، اس کے کہنے سے نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ شیخ کے شعر میں بھی یہی مطلب ادا کیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ دلیل بھی موجود ہے، یعنی یہ کہ اچھی بات انسان کے نفس میں ایک کمال ہے، جب اس نے وہ بات منہ سے نکالی تو گویا اس میں ایک کمال کم ہو گیا۔ پس آدمی ایسا کام کیوں کرے جس سے اس کے کمال میں نقصان پیدا ہو۔ اگرچہ یہ کوئی منطقی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک تمثیل ہے جس میں معقول کو محسوس کے پیرائے میں بیان کیا ہے مگر قیاساتِ شعریّہ و خطابیّہ میں ایسی تمثیلیں دلائل و براہینِ منطقیّہ سے زیادہ وقعت رکھتی ہیں × ۔ اسی طرح شیخ کی نظم و نثر میں جہاں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے لطافت سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً گلستان میں ایک دولت مند بخیل کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں:

''مالدارے را شنیدم کہ بہ بخل چناں معروف بود کہ حاتم طائی بسخاوت۔ ظاہر حالش بنعمتِ دنیا آراستہ و خسّتِ نفس در نہادش ہم چناں متمکن، تا بجائے کہ نانے را بجانے از دست نہ دادے و گربۂ ابوہریرہ را بہ لقمہ ننواختے و سگِ اصحابِ کہف را استخوانے نینداختے، فی الجملہ کسے خانۂ او را ندیدے در کشادہ و سفرۂ او را سر کشادہ۔

بیت

درویش بجز بوے طعامش نشمیدے
مرغ از پسِ ناں خوردنِ او ریزہ نچیدے''

ایک اور جگہ سمندر کی موج اور طوفان کا بیان اس طرح کیا ہے :

''سہمگین آبے کہ مرغابی در و ایمن نبودے ۔''

اگر غور سے دیکھیے تو حد سے زیادہ مبالغہ ہے ، مگر بادی النّظر میں کوئی ناممکن بات نہیں معلوم ہوتی ۔

سوپر نیچرل یعنی فوق العادۃ باتیں اور عجیب و غریب قصّے بھی ، جن سے قدیم اور متوسّط زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہوا ہے ، ان کتابوں میں بہت کم ہیں ۔ تمام گلستاں اور بوستاں میں صرف دو تین حکایتیں ایسی ہیں جو اِس زمانے میں مستبعد معلوم ہوتی ہیں اور تاویل کے بعد ان میں بھی کچھ استبعاد باقی نہیں رہتا ۔

علمِ اخلاق کے بعض اصول ، جن میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور اب بھی چلا جاتا ہے ، اگر کسی کتاب میں زمانۂ حال کے فلسفۂ مسلّمہ کے برخلاف ہوں تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا ، کیونکہ ایسی کوئی کتاب نہیں ہو سکتی جس کی سب باتوں پر تمام عالم کا اتفاق ہو ۔ مثلاً شیخ کے اس فقرے پر کہ ''دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز'' اکثر مشنری لوگ کہتے ہیں کہ جھوٹ کیسا ہی مصلحت آمیز ہو ، سچ کے برابر یا سچ سے بہتر ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ اس بحث کے متعلق ہمارے ایک دوست نے نہایت دلچسپ قصّہ نقل کیا ۔ انھوں نے کہا کہ ایک علمی سوسائٹی میں چند یورپین عالم اور مشنری موجود تھے ۔ راستی اور دروغ پر ایک

مضمون پڑھا گیا جس میں گلستان کے فقرۂ مذکور کی تائید کی گئی تھی - ایک پادری صاحب نے کہا کہ مضمون عمدہ ہے مگر جس قدر اس فقرے کی تائید میں لکھا گیا ہے اس میں سے نکال دینا چاہیے۔ اس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا - آخر ہمارے دوست ، جو اس قصے کے راوی ہیں ، انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ اس بحث کا محاکمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے تو بے شک جھوٹ بولنا کسی حالت میں جائز نہیں ، لیکن اگر جھوٹ سے کسی مظلوم کی جان بچتی ہو تو ایسی حالت میں جھوٹ بولنا بے شک سچ بولنے سے بہتر ہے - اس کے بعد انھوں نے یہ مثال دی کہ سنہ ۱۸۵۷ع میں جو اکثر لوگوں نے رحم اور انسانی ہمدردی کی راہ سے یورپین عورتوں اور بچوں کو ظالموں اور بے رحموں کے شر سے بچانے کے لیے اپنے گھروں میں چھپا لیا تھا اور باغی لوگ ان کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ایک ایک سے ان کا حال پوچھتے تھے ، ایسی حالت میں جھوٹ بول کر ان بے گناہوں کو خطرے سے بچانا بے شک سچ بولنے سے بہتر تھا - اس تقریر کو تمام مجلس نے پسند کیا اور وہ فقرہ سب کے اتفاق سے مضمون میں بحال رکھا گیا - مذکورہ بالا توجیہ کی تائید خود شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس نے گلستاں کے آٹھویں باب میں اپنی ذاتی غرض کے لیے جھوٹ بولنے کو بہت برا بتایا ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے :

گر راست سخن باشی و در بند بمانی
بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ ”صورتِ مفروضہ میں بھی مقتضائے جواں مردی یہی ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ ظالموں کا مقابلہ کر کے اپنے تئیں ان مظلوموں پر نثار کیا جائے - جب اپنے

میں سے کوئی باقی نہ رہے تب ان مظلوموں کی باری آئے تو آئے۔''
لیکن ہمارے نزدیک جب ہی تک جواں مردی ہے کہ ظالموں کے مقابلہ کرنے یا اپنی جان پر کھیلنے سے ان بے گناہوں کی جان بچ جانے کا یقین کامل ہو، ورنہ یہ حرکت تہوّر اور نادانی اور سفاہت میں شمار ہوگی۔

اسی طرح شیخ کے اس شعر کے مضمون پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے:

شمشیر نیک ز آہنِ بد چوں کند کسے
ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور قانون و مذہب اور تمام سیاستیں عبث اور فضول اور بیکار ہیں، مگر یہ مسئلہ کہ تعلیم سے انسان کی جبلّت بدل جاتی ہے یا نہیں، علمِ اخلاق کے ان مسائل میں سے ہے جن کا آج تک کسی قطعی دلیل سے فیصلہ نہیں ہوا۔ انگلستان کے ایک روشن ضمیر مورخ کی رائے ہے کہ حال کی سویلزیشن نے انسان کے اخلاق پر اس کے سوا کچھ اثر نہیں کیا کہ گناہوں کی صورتیں اور نام بدل گئے ہیں، مگر گناہ بدستور موجود ہیں۔ پہلے زمانے میں بے شک گناہ بہت سخت اور شدید اور صریح ہوتے تھے لیکن بہت کم ہوتے تھے۔ اور اب اگرچہ ویسے شدید اور سخت گناہ نہیں ہوتے لیکن نہایت کثرت سے ہوتے ہیں اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لیے رسولِ خدا (صلعم) نے فرمایا ہے کہ اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بھی انسان اپنی جبلّت سے نہیں ٹلتا۔

ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ ''یہودی کیسا ہی دولت مند ہو جائے، شریف نہیں ہوسکتا۔'' فی الواقعہ اس سے کمال تعصّب پایا

جاتا ہے ، مگر اس پر کوئی مہذب سے مہذب بھی اعتراض نہیں کر سکتا - ہر قوم اپنی حکومت کے زمانے میں محکوم قوم کو ایسا ہی سمجھتی رہی ہے - آریہ نے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو اس سے بھی زیادہ حقیر سمجھا تھا - مسلمانوں نے بھی اپنے دور میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھا اور انگریز بھی با ایں ہمہ شائستگی و تہذیب نوبلٹی یا شرافت کو اپنی ہی قوم کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں -

ایک اور جگہ گلستاں میں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک مریض بادشاہ کے لیے چند حکماے یونان نے آدمی کا پتّا ، جو خاص صفات سے موصوف ہو ، تجویز کیا تھا مگر تجربے کی نوبت نہیں آئی - یہ بات حال کی تحقیقات کے برخلاف بتائی جاتی ہے - شاید ایسا ہی ہو ، مگر شیخ اس اعتراض سے بری ہے - اس کا الزام جو کچھ ہے مجّوزین پر ہے ، نہ ان کی تجویز کے راوی پر - شیخ پر البتہ اس صورت میں اعتراض ہو سکتا تھا کہ وہ ان کی تجویز کو پسند کرتا ، یا یہ لکھتا کہ اس سے بادشاہ کو شفا ہوگئی ، یا جو فرض معلّمینِ اخلاق کا ہے (یعنی ہر قصّے اور افسانے سے ایک مفید نتیجہ استخراج کرنا) اس سے عہدہ برآ نہ ہوتا -

بعض مُلّایانہ اعتراض بھی شیخ کے کلام پر سنے گئے - مثلاً اس نے گلستاں میں کہا ہے :

رہِ راست برو اگرچہ دور است
زنِ بیوہ مکن اگرچہ حور است

اس پر بعض حضرات یہ نقض وارد کرتے ہیں کہ جس امر کی اجازت شریعت سے پائی جاتی ہے اس سے منع کرنے کے کیا معنی ؟

اور بعضے کٹ مثلاً بیوہ کی جگہ بیوہ[1] بتاتے ہیں ، جس کے معنی انھیں کو معلوم ہیں - یہ ویسا ہی اعتراض ہے جس پر کسی نے کہا تھا ''شعرِ مرا بمدرسہ کہ بُرد -'' ظاہر ہے کہ شیخ کی کتاب گلستان کوئی فقہ کا فتاویٰ نہیں ہے کہ جس کی ہر امر و نہی کو امر و نہی مصطلح فقہا پر محمول کیا جائے - وہ اکثر اپنے تجربے اور رائے کے موافق جس بات کو بنی نوع کے حق میں مفید سمجھتا ہے اس کی ترغیب دیتا ہے اور جس کو مضر سمجھتا ہے۔اس سے منع کرتا ہے ، گو فقہا نے اس کو مُباح لکھا ہو ، کیونکہ مباحات میں فعل اور ترک دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے - رہی یہ بات کہ شیخ کی رائے فی نفسہ کیسی ہے ؟ سو حدیثِ نبوی سے بھی ابکار کی ترجیح ثیّبات پر ثابت ہوتی ہے -

سب سے زیادہ معقول اعتراض بوستان کی اس حکایت پر وارد ہوتے ہیں جس میں شیخ نے سومنات کا قصّہ لکھا ہے ، مگر ہم نے اس کی بابت پہلے باب میں کچھ عذر لکھے ہیں جن سے اعتراض کسی قدر ہلکے ہو سکتے ہیں -

امرد پرستی کا ذکر جو ان کتابوں میں اکثر آتا ہے ، یہ بھی سخت اعتراض کے قابل بات معلوم ہوتی ہے ، مگر اس باب میں جو کچھ ہم نے خاتمۂ کتاب میں لکھا ہے وہ شاید ان اعتراضوں کے فیصلے کے لیے کافی ہے -

ایسے ایسے اعتراضوں سے بجائے اس کے کہ ان کتابوں کی

---

۱ - بیوہ کے معنی لغت میں متجدّد اور متغیر ہونے کے لکھے ہیں جو اس شعر میں کسی طرح چسپاں نہیں ہوسکتے - (حاشیہ حیاتِ سعدی ، شائع کردہ ملک چنن دین تاجر کتب ، لاہور ، صفحہ ۱۲۱)

قدر و قیمت میں کچھ فرق آئے اور زیادہ ان کی عظمت ثابت ہوتی ہے ۔ کپڑا جس قدر زیادہ اجلا ہوتا ہے اسی قدر جلد ذرا سے دھبے سے میلا ہوتا ہے ۔ ان کتابوں کا بھی یہی حال ہے ۔ یہ کتابیں ساڑھے چھ سو برس سے برابر تعلیم میں داخل رہی ہیں اور آج کل بھی کہ نہایت نکتہ چینی کا زمانہ ہے ، اسی طرح مشرق سلسلۂ تعلیم کا جزوِ اعظم ہیں ۔ ان کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک مصرع کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے ۔ مشنریوں نے صرف اس وجہ سے کہ ان میں مسلمانوں کی مذہبی باتیں بہت ملی ہوئیں ہیں اور ایسے مضامین کا سلسلۂ تعلیم میں داخل رہنا مشن کے مقاصد کے برخلاف ہے ، ان پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے بڑے بڑے طولانی ریویو لکھ کر چھپوائے ہیں ، نیز اس لحاظ سے کہ ان کتابوں کو زیادہ تر صغیرِ سن بچے پڑھتے ہیں اور بھی زیادہ چھان بین کی گئی ہے ۔ باوجود ان سب باتوں کے ایسے چند سرسری اعتراضوں کا وارد ہونا ، جیسے کہ اوپر ذکر کیے گئے ہیں ، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بلا شبہ اس قدر بے عیب ہیں جس قدر کہ زمانۂ متوسّط میں انسان کا کلام بے عیب ہو سکتا تھا ۔

۲ ۔ دوسری عام اور بڑی خوبی جو ان کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے ، وہ شیخ کا اندازِ بیان ہے جس کا ملکہ اس کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا ۔ یہ بات نہ قواعدِ علمِ بلاغت کی پابندی سے حاصل ہوسکتی ہے اور نہ کسی استاد کی تعلیم سے آتی ہے ، بلکہ جس طرح حسنِ صورت اور حسنِ صوت قدرتی خوبیاں ہیں اسی طرح حسنِ بیان بھی ایک جبّلی خاصہ ہے جس میں اکتساب کو کچھ دخل نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی کمی اور زیادتی پر شاعری کا نقصان اور کمال موقوف ہے ۔ جو مطلب اس کو بیان کرنا ہوتا ہے اس کے

لیے وہ ایسا دلکش اور لطیف پیرایہ ڈھونڈ لاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا ۔ مثلاً عربی میں ایک قول مشہور ہے : ''اَلصَّمْتُ زِیْنَۃُ الْعَالِمِ وَ سِتْرُالجَاہِلِ ۔'' (یعنی خاموشی عالم کی زینت ہے اور جاہل کی پردہ پوش) ۔ اس مطلب کو وہ شعر میں اس طرح بیان کرتا ہے :

ترا خامشی اے خداوندِ ہوش
وقارست و نا اہل را پردہ پوش
اگر عالمی ہیبتِ خود مبر
وگر جاہلی پردۂ خود مدر

یا مثلاً اس کو بیان کرنا ہے کہ جو لوگ نصیحت نہیں سنتے وہ آخر کو پچھتاتے ہیں یا زک اٹھاتے ہیں ، اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے :

''ہر کہ نصیحت نشنود سر ملامت شنیدن دارد ۔''

یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا ہے کہ ہر شے کی قدر اس کے کمیاب ہونے سے ہوتی ہے ، اس کو وہ اس طرح لکھتا ہے :

اگر شبہا ہمہ شبِ قدر بودے
شبِ قدر بے قدر بودے

یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا ہے کہ اپنے سے زیادہ علم والے سے مباحثہ کرنا نادانی ہے ، اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :

''ہر کہ با داناترے از خود مجادلہ نماید تا بدانند کہ داناست بدانند کہ نادانست ۔''

یا مثلاً اس مطلب کو کہ سب پیٹ کی خاطر سختی آٹھاتے ہیں ، وہ اس عنوان سے بیان کرتا ہے :

''اگر جورِ شکم نبودے ہیچ مرغ در دام نیفتادے بلکہ صیّاد خود دام ننہادے ۔''

یا مثلاً یہ بات کہ حاکم رشوت سے دھیما ہو جاتا ہے ، اس طرح بیان کرتا ہے :

''ہمہ کس را دندان بہ ترشی کُند گردد مگر قاضیان را بہ شیرینی ۔''

یا مثلاً اس مطلب کو کہ ریا کے لیے لذّتوں کو ترک کرنا برا ہے ، وہ اس اسلوب سے ادا کرتا ہے :

''ہر کہ ترکِ شہوت از بہرِ قبولِ خلق دادہ است از شہوتِ حلال در شہوتِ حرام افتادہ است ۔''

یا مثلاً اس کو یہ لکھنا ہے کہ کسی کی آہ و زاری سے قضائے الٰہی نہیں بدلتی اور قانونِ قدرت نہیں ٹوٹتا ، اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے :

قضا دگر نشود ور ہزار نالہ و آہ
بشکر یا بہ شکایت برآید از دہنے
فرشتہ کہ وکیل ست بر خزائنِ باد
چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے

یا اس کو یہ کہنا ہے کہ اے ریاکار ! یہ دکھاوے کی عبادت تجھ کو خدا تک نہ پہنچائے گی ، اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے :

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی !
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

کبھی وہ ایک نصیحت کے مضمون کو ، جو اسے بیان کرنا ہے ، ایک واقعے کی صورت میں بیان کرکے اس کو زیادہ پُرتاثیر اور دل نشین کر دیتا ہے ۔ مثلاً اس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگ ہزارہا آمیدیں اور ارمان دل میں لیے ہوئے مر گئے اسی طرح ایک روز ہم تم بھی مر جائیں گے ، اس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے :

شنیدم کہ یکبار در دجلۂ
سخن گفت با عابدے کلّۂ

کہ من فرِّ فرماندہی داشتم
بسر بر کُلاہے مہی داشتم

سپہرم مدد کرد و نصرت وفاق
گرفتم ببازوے دولت عراق

طمع کردہ بودم کہ کرماں خورم
کہ ناگہ بخوردند کرماں سرم

بکن پنبۂ غفلت از گوشِ ہوش
کہ از مُردگاں پندت آید بگوش

اخیر کے شعر سے اس نے یہ بات جتا دی ہے کہ حقیقت میں کوئی کھوپری نہیں بولی تھی بلکہ یہ صرف ایک بیان کرنے کا پیرایہ ہے ۔ یا مثلاً اس کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہر شخص اپنے مذہب کو حق اور دوسرے کے مذہب کو باطل سمجھتا ہے ، اس مطلب

کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :

یکے جہود و مسلماں خلاف مے جستند
چناں کہ خندہ گرفت از نزاع ایشانم

بہ طنز گفت مسلماں گر ایں قبالۂ من
درست نیست ، خدایا جہود میرانم

جہود گفت بتوریت می خورم سوگند
وگر خلاف کنم ہم چو تو مسلمانم

گر از بسیطِ زمیں عقل منعدم گردد
بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

یہ مطلب اگر ایک جلد میں بیان کیا جائے تو بھی اتنا مؤثر اور دلآویز نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس پیرایے نے اس کو دلآویز اور مؤثر کر دیا ہے۔ یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا تھا کہ امن اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان لوگوں کے قصّے جھگڑوں سے علیحدہ رہے اور خود داری کو ہاتھ سے نہ دے ، اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :

دو کس گرد دیدند و آشوب و جنگ
پراگندہ نعلین و پرّندہ سنگ

یکے فتنہ دید از طرف بر شکست
یکے در میاں آمد و سر شکست

کسے خوشتر از خویشتن دار نیست
کہ با خوب و زشتِ کسش کار نیست

یا مثلاً اس کو یہ لکھنا منظور تھا کہ جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا ہے ، وہ ایک بڑی جواب دہی اپنے ذمے لیتا ہے ، اس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے :

آں شنیدی کہ صوفیے مے کوفت
زیرِ نعلینِ خویش میخے چند
آستینش گرفت سرہنگے
کہ بیا نعل بر ستورم بند

اس میں پیرایۂ بیان کے علاوہ صوفی کی تخصیص کرنے سے شوخی اور ظرافت بھی انتہا کے درجے کی برتی ہے - یا مثلاً اس کو یہ لکھنا تھا کہ بھیک مانگنا ، جو ایک مذموم خصلت ہے ، اس کا الزام صرف فقیروں ہی پر نہیں بلکہ دولت مندوں پر بھی ہے ، اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :

''خواہندۂ مغربی در صفِ بزازانِ حلب می گفت ''اے خداوندانِ نعمت! اگر شما را انصاف بودے و ما را قناعت ، رسمِ سوال از جہاں برخاستے۔'' یا مثلاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تواضع اور انکسار سے عزت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے ، اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید
خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائیکہ دریاست من کیستم
گر او ہست حقّا کہ من نیستم
چو خود را بچشمِ حقارت بدید
صدف در کنارش بجاں پرورید

سپہرش بجائے رسانید کار
کہ شد نامور لولوے شاہوار

بلندی بداں یافت کو پست شد
در نیستی کوفت تا ہست شد

یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح پارسا لوگ رندوں کی صحبت سے منقبض ہوتے ہیں اسی طرح رند لوگ پارساؤں کی صحبت سے گھبراتے ہیں ، اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :

زاہدے درمیانِ رنداں بود
زاں میاں گفت شاہدے بلخی

گر ملولی ز ما ترش منشیں
کہ تو ہم درمیانِ ما تلخی

کبھی وہ اپنے ہی کلام کو کسی آور کا مقولہ قرار دے کر نہایت بامزہ کر دیتا ہے ، جیسے :

دو بیتم جگر کرد روزے کباب
کہ میگفت گویندۂ با رباب

دریغا کہ بے ما بسے روزگار
بروید گل و بشگفد نو بہار

بسے تیر و دے ماہ و آردی بہشت
بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت

یا جیسے :

چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن
کہ مے گویند ملّاحاں سرودے

اگر باران بہ کوہستاں نہ بارد
بسالے دجلہ گردد خشک رودے

یا جیسے :

ہم چناں در فکرِ آں بیتم کہ گفت
پیل بانے بر لبِ دریائے نیل
زیرِ پایت گر بدانی حالِ مور
ہمچو حالِ تست زیرِ پائے پیل

یا جیسے :

چہ خوش گفت با کودک آموزگار
کہ کارے نکردیم و شد روزگار

یا جیسے :

آں شنیدی کہ شاہدے بہ نہفت
با دل از دست دادۂ مے گفت
تا تُرا قدرِ خویشتن باشد
پیشِ چشمت چہ قدرِ من باشد

۳ - ان دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی و معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں اور تقریباً نصف گلستاں کے فقرے مُسجّع اور مقفّیٰ ہیں ، با ایں ہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں نثرِ عاری کا ذکر آتا ہے وہاں سب سے پہلے گلستاں کی مثال دی جاتی ہے - فی الواقعہ یہ شیخ کی کمالِ انشا پردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے - شاعر اور منشی جب الفاظ کی زیادہ رعایت کرتا ہے تو اس کے کلام میں خواہی

نخواہی بناوٹ اور تکلّف پیدا ہو جاتا ہے اور سررشتۂ حسنِ معنی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے - شیخ نے صنائع لفظی و معنوی کو ایسی خوبصورتی اور سلیقے سے برتا ہے کہ کہیں ساختگی اور تصنع کا گمان نہیں ہوتا - مگر وہ ان عارضی آرایشوں کا ایسا پابند نہیں ہے کہ ان کے لیے فصاحت و بلاغت سے دست بردار ہو جائے - جہاں الفاظ مساعدت کرتے ہیں وہاں ایک ہلکی سی چاشنی اس کی بھی دے دیتا ہے - اس کی نثر میں مسجّع اور مرصّع فقرے سادے فقروں میں ایسے ملے ہوئے ہیں جیسے پشمینے کی شال میں ریشم کے تار - جب تک خاص توجّہ سے نہ دیکھا جائے ، تمام فقرے یکساں اور ہموار معلوم ہوتے ہیں - البتہ بعض حکایتوں میں اس نے صنائع لفظی و معنوی کی زیادہ رعایت کی ہے - جیسے ساتویں باب کی انیسویں حکایت ، جس میں اپنا اور ایک شخص کا مناظرہ تونگری اور درویشی کے باب میں لکھا ہے ، مگر اس میں بھی الفاظ کو حسنِ معنی میں خلل انداز ہونے نہیں دیا - جس قدر اس حکایت کے الفاظ میں تناسب اور حسنِ انتظام پایا جاتا ہے ، اس سے زیادہ خیالات میں سنجیدگی اور اصلیّت اور واقعیّت موجود ہے - حکایتِ مذکور کے چند متفرق فقرے بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

''تونگراں دخل مسکینانند و ذخیرۂ گوشہ نشیناں ، و مقصدِ زائراں و کہفِ مسافراں و متحمّلِ بارِ گراں از بہرِ راحتِ دگراں - دست بطعام آنگہ برند کہ متعلّقاں و زیر دستاں بخورند و فضلۂ مکارمِ ایشاں بہ ارامل و ایتام و پیراں و اقارب و جیران برسد[1] . . . . از معدۂ خالی چہ قوّت آید ، و از دستِ تہی

---

۱ - یہ نشان . . . . اس بات کے ہیں کہ یہاں کچھ فقرے چھوڑ دیے گئے ہیں -

چہ مروّت زاید و از پاے بستہ چہ سیر آید و از دستِ گرسنہ چہ خیر .... فراغت با فاقہ نمی پیوندد ، و جمعیّت با تنگدستی صورت نہ بندد ، یکے تحریمۂ عِشا بستہ و دیگرے منتظرِعِشا نشستہ ایں بداں کے ماند .... اشارتِ خواجۂ عالم بفقر طائفہ ایست کہ مردِ میدان رضا اند و تسلیم تیرِ قضا ، نہ ایناں کہ خرقۂ ابرار پوشند و لقمۂ ادرار نوشند .... مشغولِ کفاف از دولتِ عفاف محروم است و مُلکِ فراغت زیرِ نگینِ رزقِ معلوم .... -

گفت چنداں مبالغہ در وصفِ ایشاں بکردی و سخنہاے پریشاں بگفتی کہ وہم تصوّر کند تریاقند یا کلیدِ خانۂ ارزاق ، مشتے متکبّر و مغرور و مُعجب و نفور - مشتغلِ مال و نعمت و مفتتنِ جاہ و ثروت - سخن نگویند الّا بسفاہت و نظر نہ کنند الّا بکراہت ، علما را بہ گدائی منسوب کنند و فقرا را بہ بے سروپائی معیوب گردانند ، بعزّت مالے کہ دارند و غیرت جاہے کہ پندارند بر تر از ہمہ نشینند و خود را بہتر از ہمہ شناسند ، نہ آں در سر دارند کہ سر بکسے فرود آرند ، بے خبر از قولِ حکما کہ گفتہ اند "ہر کہ بطاعت از دیگراں کم ست و بنعمت بیش ، بصورت توانگر ست و بمعنی درویش" ..... گفتم مذمّت ایشاں روا مدار کہ خداوندانِ کرم اند - گفت غلط کردی کہ بندگانِ درم اند - چہ فائدہ کہ ابر آذارند و بر کس نمی بارند ، و چشمۂ آفتابند و بر کس نمے تابند ، و بر مرکبِ استطاعت سوارند و نمیرانند ، و قدمے بہرِ خدا نہنند ، و درمے بے منّ و اذی ندہند - مالے بمشقت فراہم آرند و بہ خسّت نگہدارند ، و بحسرت بگزارند ، چناں کہ بزرگاں گفتہ اند "سیم بخیل وقتے از خاک برآید کہ بخیل بہ خاک در آید" ..... گفتمش بر بخل خداوندانِ نعمت وقوف نیافتۂ الّا بہ علّتِ گدائی ، وگرنہ ہر کہ طمع یکسو نہد ، کریم و بخیلش یکے نماید - محک داند کہ زر چیست ، و گدا داند کہ ممسک

کیست . . . . . . محال عقلست که اگر ریگ بیابان دُر شود ، چشم گدایان پُر شود . . . . ہرگز دیدهٔ دست دغائی بر کتف بسته ، یا بعلّت بے نوائی در زندان نشسته ، یا پردهٔ معصومی دریده ، یا کفے از معصم بریده ، الّا به علّت درویشی ، شیر مردان را بحکم ضرورت در نقبہا گرفته اند ، و کعبہا سفته . . . . اغلب تہی دستان دامن عصمت به معصیت آلایند و گرسنگان نان مردم ربایند ۔

بیت

چوں سگ درّنده گوشت یافت نه پُرسد
کیں شُتر صالح علیہ ست یا خرّ دجّال

. . . . گفتا نه ، که من بر حال ایشان رحمت می برم ، گفتم نه که بر مال ایشاں حسرت می خوری . . . . ہر بیذقے که براندے بدفع آں کوشیدمے ، و ہر شاہے که بخواندے بفرزیں بپوشیدمے ، تا نقد کیسهٔ ہمّت در باخت ، و تیر جعبهٔ حجّت ہمه بینداخت . . . . ہر جا که گل ست خار ست و با خمر خمار ، و بر سر گنج مار ، و آنجا که دُرّ شاہوار ست ، نہنگ مردم خوار ، لذّت عیش دُنیا را لدغهٔ اجل در پس ست ، و نعیم بہشت را دیو مکاره در پیش . . . . . نظر نه کنی در بستان که بید مشک ست و چوب خشک ، ہم چنیں در زمرهٔ تونگراں شاکرند و کفور و در حلقهٔ درویشاں صابرند و ضَجور . . . . . مقرباں حضرت حق جلّ و علا تونگرانند درویش سیرت و درویشانند تونگر ہمت مہین تونگراں آنست که غم درویشاں بخورد ، و بہین درویشاں آں که کم تونگراں گیرد . . . . نعم طائفهٔ ہستند بدیں صفت که بیان کردی ، قاصر ہمت و کافر نعمت که ببرند و بنہند و بخورند و ندہند . . . . قومے بریں نمط ہستند که شنیدی ، و طائفه

خوانِ نعمت نہادہ و صلاے کرم در دادہ ، و میاں بخدمت بستہ ، و ابرو بتواضع کشادہ طالبِ نام اند و مغفرت و صاحبِ دنیا و آخرت ۔''

شیخ اکثر ان کتابوں میں ایسی حکایتیں لکھتا ہے جن میں باجود موعظتِ بلیغ کے کسی قدر ظرافت و خوش طبعی کی بھی گنجائش ہو ۔ پھر اپنے حسنِ بیان سے تمام حکایت کو نہایت لطیف و ملیح کر دیتا ہے ۔ اور کبھی وہ ایک سیدھی سادی حکایت میں کوئی گرم فقرہ یا لطیف کنایہ ایزاد کر کے اس میں نون مرچ لگا دیتا ہے تا کہ پند و موعظت کی تلخی ظرافت کی چاشنی سے دور ہوجائے۔ چنانچہ گلستان کے خاتمے میں اس نے لکھا ہے :

''غالب گفتارِ سعدی طرب انگیز ست و طیب آمیز ۔ و کوتہ نظراں را بدیں علت زبانِ طعنہ دراز کہ ''مغزِ دماغ بیہودہ بردن و دودِ چراغ بے فائدہ خوردن کارِ خردمنداں نیست ۔ و لیکن بر راے روشن صاحب دلاں کہ روے سخن در ایشان ست پوشیدہ نماند کہ دُرِ موعظت ہائے صافی در سلکِ عبارت کشیدہ است و داروے تلخِ نصیحت بشہدِ ظرافت آمیختہ ، تا طبعِ ملولِ انساں از دولتِ قبول محروم نماند ۔''

جو ظرافت اس نے گلستاں اور نیز بوستاں میں برتی ہے وہ اکثر نہایت سنجیدہ اور معقول ہے ۔ البتہ کہیں کہیں اس کے قلم سے ایسے الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں جو قانونِ شرم و حیا سے کسی قدر متجاوز ہیں لیکن ایک ظریف طبع اور شوخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے بچنا اسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد اور عورت تقریباً تمام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور جہاں مردوں کو عورتوں کی مجالست اور ان کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ہمیشہ تقریر و تحریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے ، ورنہ طبیعت کی شوخی ایک

ایسی چیز ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح رک نہیں سکتی -

نکو رُو تابِ مستوری ندارد
چو در بندی سر از روزن برآرد

اس قسم کی چند حکایتیں مثال کے طور پر یہاں لکھی جاتی ہے :

مثال ۱ - مہمانِ پیرے بودم در دیارِ بکر کہ مالِ فراواں داشت و فرزندے خوبروے - شبے حکایت کرد کہ ''مرا در ہمہ عمر جز ایں فرزند نبودہ است ، درختے دریں وادی زیارت گاہ ست کہ مردماں بہ حاجت خواستن آنجا روند - شب ہاے دراز در پاے آں درخت بحق نالیدہ ام تا مرا ایں فرزند بخشیدہ -'' شنیدم کہ پسر با رفیقاں ہمی گفت ''چہ بودے اگر من آں درخت را بدانستمے کہ کجا است تا دعا کردمے کہ پدرم زود تر بمیرد -'' خواجہ شادی کناں کہ پسرم عاقلست و پسر طعنہ زناں کہ پدرم فرتوت لا یعقل -

قطعہ

سالہا بر تو بگذرد کہ گزر
نکنی سوے تربتِ پدرت
تو بجاے پدر چہ کردی خیر
تا ہماں چشم داری از پسرت

مثال ۲ - پیر مردے را حکایت کنند کہ دخترے خواستہ و حجرہ بگل آراستہ و بخلوت با او نشستہ و دیدہ و دل درو بستہ ، شبہاے دراز نخفتے و بذلہا و لطیفہا گفتے ، باشد کہ موانست پذیرد و وحشت نگیرد - بالجملہ شبے میگفت ''بخت بلندت یار بود و چشمِ دولتت بیدار کہ بہ صحبتِ پیرے افتادی پختۂ ، پروردۂ ، جہاندیدۂ ،

آرمیدهٔ ، نیک و بدِ جہان آزمودهٔ ، سرد و گرمِ روزگار چشیدهٔ کہ حقِ صحبتِ بداند و شرطِ مودّت بجا آرد ، مشفق و مہربان ، خوش طبع و شیریں زبان ۔

مثنوی

تا توانم دلت بدست آرم
در بیازاریم نیازارم
ور چو طوطی‌شکر بوَد خورشت
جانِ شیریں فدائے پرورشت

نہ گرفتار آمدی بدست جوانے مُعجب ، خیرہ رائے ، سر تیز ، سبک پائے کہ ہر دم ہوَسے پزد و ہر شب جائے خسپد و ہر روز یارے گیرد ۔

قطعہ

جوانان خرّم اند و خوب رخسار
ولیکن در وفا با کس نپایند
وفاداری مدار از بلبلاں چشم
کہ ہردم بر گلے دیگر سرایند

برخلافِ پیراں کہ بعقل و ادب زندگانی کنند ، نہ بمقتضائے جہل و جوانیؔ ۔

بیت

ز خود بہترے جوے و فرصت شمار
کہ باچوں خودے گم کنی روزگار

گفت : چنداں کہ بریں نمط بگفتم گماں بردم کہ دلش در قیدِ من آمد و صیدِ من شد ۔ ناگاہ نفسے سرد از دلِ پُردرد برآورد و گفت کہ چندیں سخن کہ گفتی در ترازوے عقلِ من وزنِ آں یک سخن ندارد کہ وقتے شنیدہام از قابلۂ خویش کہ گفت ''زنِ جواں را اگر تیرے در پہلو نشیند بہ کہ پیرے ۔'' فی الجملہ امکانِ موافقت نبود بمفارقت انجامید ۔ چوں مدّتِ عدّتش بسر آمد عقدِ نکاحش بستند با جوانے تُند ، ترش روے ، تہیدست ، بدخوے ، جور و جفا مے دید و رنج و عنا میکشید و شکرِ نعمتِ حق ہم چناں میگفت کہ الحمدللہ کہ ازاں عذابِ الیم برہیدم و بدیں نعمتِ مقیم رسیدم ۔

قطعہ

با تو مرا سوختن اندر عذاب
بہ کہ شدن با دگرے در بہشت

بوے پیاز از دہنِ خوبروے
خوب تر آید کہ گل از دستِ زشت

مثال ۳

مرا حاجیے شانۂ عاج داد
کہ رحمت بر اخلاقِ حجّاج باد

شنیدم کہ بارے سگم خواندہ بود
کہ از من بنوعے دلش ماندہ بود

بینداختم شانہ کیں استخواں
نمی بایدم دیگرم سگ مخواں

مپندار چوں سرکۂ خود خورم
کہ جورِ خداوندِ حلوا برم

قناعت کن اے نفس بر اندکے
کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیشِ خسرو بحاجت روی
چو یکسو نہادی طمع ، خسروی

یہاں پہلی بیت کے دوسرے مصرع میں رحمت کا لفظ کنایۃً بجائے نفرین اور اس کے مرادف الفاظ کے لایا گیا ہے کیونکہ شعراء کے نزدیک حاجیوں کی سنگ دلی ، قساوت اور تکبّر وغیرہ صفاتِ ذمیمہ مسلّم ہیں - چنانچہ گلستاں میں بھی شیخ نے ایک جگہ لکھا ہے :

از من بگوے حاجی مردم گزاے را
کو پوستینِ خلق بہ آزار میدرد
حاجی تو نیستی شترست از براے آنکہ
بے چارہ خار میخورد و بار میبرد

ایک اور شاعر کہتا ہے :

چوں عاملے کہ دل ز دریخانہ جمع کرد
حاجی ستم بخلقِ خدا بیشتر کند

پس ظاہر ہے کہ جو شوخی اس کنائے میں ہے وہ صراحت میں ہرگز ممکن نہ تھی - اکثر ناواقف لوگ اس جگہ رحمت کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں مگر حکایت کا مضمون ، جس سے رنجش اور شکایت پائی جاتی ہے ، حقیقی معنی سے ابا کرتا ہے -

مثال ۴ - بازارگانے را دیدم کہ صد و پنجاہ شتر بار داشت و چہل بندۂ خدمتگار - شبے در جزیرۂ کیش مرا بحجرۂ خویش برد ،

و ہمہ شب نیار میداز سخنہاے پریشاں گفتن کہ ''فلاں انبارم بہ ترکستان ست ، و فلاں بضاعت بہ ہندوستان ، و ایں قبالۂ فلاں زمیں است و فلاں مال را فلاں کس ضمیں ۔ گاہ گفتے کہ خاطر اسکندریہ دارم کہ ہوایش خوش ست و باز گفتے نے ، دریاے مغرب مشوّش ست ۔ سعدیا ! سفرے دیگر در پیش ست ، اگر آں کردہ شود بقیت عمر بگوشہ نشینم ۔ گفتم آں کدام سفر ست ؟ گفت گوگردِ پارسی بہ چین خواہم بُردن کہ شنیدم قیمتِ عظیم دارد ، و از آنجا کاسۂ چینی بروم برم و دیباے رومی بہ ہند ، و پولادِ ہندی بہ حلب و آبگینۂ حلبی بہ یمن ، و بُرد یمانی بہ پارس ، ازاں پس ترکِ سفر کنم و بدکانے نشینم ۔ چندانے ازیں مالیخولیا فرو گفت کہ بیش طاقتِ گفتنش نماند ۔ گفت ، سعدی تو ہم سخنے بگو از آنہا کہ دیدی و شنیدی ۔ گفتم :

نظم

آں شنیدستی کہ وقتے تاجرے
در بیابانے بیفتاد از ستور
گفت چشمِ تنگِ دنیادار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

مثال ۵

ملک صالح از بادشاہانِ شام
بروں آمدے صبح دم با غلام
بگشتے در اطرافِ بازار و کوے
برسمِ عرب نیمہ بر بستہ روے

که صاحب نظر بود و درویش دوست
بران کین دو دارد ملک صالح اوست

دو درویش در مسجدے خفته یافت
پریشاں دل و خاطر آشفته یافت

شب سرد شاں دیده نا برده خواب
چو حربا تأمل کناں آفتاب

یکے زاں دو مے گفت با دیگرے
که در روز محشر بود داورے

گر ایں پادشاہان گردن فراز
که در لہو و عیش اند و با کام و ناز

در آیند با عاجزاں در بہشت
من از گور سر بر نگیرم زخشت

بہشت بریں ملک و ماوائے ماست
که بند غم امروز بر پائے ماست

ہمه عمر ازیناں چه دیدی خوشی
که در آخرت نیز زحمت کشی

اگر صالح آنجا بدیوار باغ
در آید بکفشش بدرم دماغ

چو مرد ایں سخن گفت و صالح شنید
دگر بودن آنجا مصالح ندید

دمے رفت تا چشمۀ آفتاب
ز چشم خلائق فروشست خواب

روان ہر دو کس را فرستاد و خواند
بہ ہیبت نشست و بہ حرمت نشاند

بر ایشان ببارید بارانِ جُود
فروشست شان گرد ذُل از وجود

پس از رنجِ سرما و باران و سیل
نشستند با نامدارانِ خیل

گدایانِ بے جامہ شب کردہ روز
معطّر کنان جامہ بر عود سوز

یکے گفت ازینان ملک را نہان
کہ اے حلقہ در گوش حکمت جہان

پسندیدگان در بزرگی رسند
ز ما بندگانت چہ آمد پسند

شہنشہ ز شادی چو گل بر شگفت
بخندید در روے درویش و گفت

من آنکس نیم کز غرورِ حشم
ز بے چارگان روے در ہم کشم

تو ہم با من از سر بنہ خوے زشت
کہ ناسازگاری کنی در بہشت

من امروز کردم درِ صلح باز
تو فردا مکن در برویم فراز

چنیں راہ ، گر مُقبلی ، پیش گیر
شرف بایدت دستِ درویش گیر

بر از شاخِ طوبی کسے بر نداشت
کہ امروز تخمِ ارادت نہ کاشت

ارادت نداری سعادت مجوے
بچوگانِ خدمت تواں برد گوے

ترا کے بود چوں چراغ التہاب
کہ از خود پری ہمچو قندیل ز آب

وجودے دہد روشنائی بہ جمع
کہ سوزیش در سینہ باشد چو شمع

۵ - وہ اکثر نہایت پاکیزہ اور لطیف نکتے ، جن سے عموماً اذہان خالی ہوتے ہیں ، ایسی معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتا ہے جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں -

مثال ۱ - ہر نفسے کہ فرو میرود ممدِّ حیات ست و چوں بر می آید مفرّح ذات - پس در ہر نفسے دو نعمت موجودست و بر ہر نعمتے شکر واجب -

یہ بات کہ داخلی اور خارجی دونوں سانس انسان کی زندگی اور تفریح کا باعث ہیں ، سب کو معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر ایک نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے ، مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ ہر سانس میں خدا کا شکر کرنا واجب ہے -

مثال ۲

چو طفل اندروں دارد از حرص پاک
چہ مشتِ زرش پیش و چہ مشتِ خاک

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ بچہ حرص اور طمع سے پاک ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اس کو سونے اور مٹی میں کچھ تمیز نہیں ہوتی ، مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ سونے اور مٹی کو برابر جاننا ، جو کہ اعلیٰ درجے کے عرفا اور خدا رسیدہ لوگوں کا منصب ہے ، بچے کو گویا فقط حرص اور طمع سے پاک ہونے کے سبب حاصل ہے ، کیونکہ سونے اور مٹی میں کچھ فرق نہ کرنا اس میں جبھی تک باقی رہتا ہے ، جب تک حرص اور طمع پیدا نہیں ہوتی - پس ایک شاعر نہ کہ فلسفی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں -

مثال ۳

ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم
دگر با چو او صد برائی بجنگ

ازاں مار بر پاے راعی زند
کہ ترسد سرش را بکوبد بہ سنگ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی عاجز اور زبردست بھی زبردستوں پر غالب آ جاتے ہیں اور سانپ کا وار بھی کبھی کبھی چرواہے پر چل جاتا ہے ، مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ جو اپنے سے ڈرے اس سے ڈرنا چاہیے ، کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ جو اپنے سے ڈرے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں -

مثال ۴

وہ کہ گر مردہ باز گردیدے
بہ میانِ قبیلہ و پیوند

رّدِ میراث سخت تر بودے
وارثاں را از مرگِ خویشاوند

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ میراث بہت عزیز چیز ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ مرگ خویشاوند سخت مصیبت ہے، مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ اگر مردہ پلٹ کر آتا تو وارثوں کو میراث کا واپس دینا اس کے ماتم کے رنج سے زیادہ سخت اور ناگوار ہوتا۔

اسی طرح وہ نہایت سرسری اور معمولی سرگزشتوں سے ایسے نادر اور اچھوتے نتیجے نکال لیتا ہے جو وہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہ میرے باپ نے بچپن میں مجھ کو ایک انگوٹھی پہنا دی تھی۔ ایک روز ایک شخص نے ایک کھجور دے کر مجھ سے وہ انگوٹھی لے لی۔ چونکہ بچہ انگوٹھی کی قدر نہیں جانتا اس لیے ذرا سی مٹھاس کا لالچ دے کر اس سے لی جا سکتی ہے۔ پس جو لوگ عمر کو عیشِ شیریں میں برباد کرتے ہیں، شاید وہ عمر کی قدر نہیں جانتے۔ یا مثلاً میں ایک بار عید کے دن باپ کے ساتھ عیدگاہ میں گیا، اتفاقاً خلقت کے ہجوم میں باپ سے بچھڑ گیا۔ میں اسی حالت میں رو رہا تھا کہ باپ نے آ کر دفعۃً میرا کان مروڑا اور فرمایا: ''میں نے تجھ کو بارہا کہا ہے کہ میرا دامن پکڑے رہا کر، مگر تو نہیں مانتا۔'' سچ ہے جس طرح انجان بچہ اپنے آپ رستہ نہیں چل سکتا، اسی طرح سالک بغیر مشائخ اور کاملین کی دستگیری کے منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔

یا مثلاً میرے جسم میں کپڑوں کے اندر ایک زخم تھا۔ شیخ علیہ الرحمۃ ہمیشہ پوچھتے تھے کہ کیسا ہے؟ مگر یہ کبھی نہ کہتے تھے کہ کہاں ہے؟ اس سے میں نے جانا کہ ہر عضو کا

نام لینا روا نہیں ہے ۔

یا مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کے کان امیٹھ کر کہا کہ ''نالائق! میں نے تجھ کو کلھاڑی لکڑیاں چیرنے کو دی تھی ، مسجد کی دیوار ڈھانے کو نہیں دی تھی ۔'' اسی طرح زبان ذکر اور شکر کے لیے بنی ہے ، لوگوں کی غیبت کرنے کے لیے نہیں بنی ۔ یا مثلاً ایک شخص مٹی میں سنا ہوا مسجد میں جانے لگا ، دوسرے نے اس کو جھڑک دیا کہ ''خبردار جو مسجد میں قدم رکھا ۔'' میرا دل یہ بات سن کر بھر آیا کہ افسوس ! بہشت میں بھی ، جو ایک پاک جگہ ہے ، دامن آلودہ لوگ نہ جا سکیں گے ۔

۶ ۔ حسنِ تاویل اور لطفِ استدلال جیسا جچا تُلا اس کے کلام میں پایا جاتا ہے ، ایسا اَور شعرا کے کلام میں نہیں دیکھا گیا ۔

مثال ۱

شنیدی کہ در روزگارِ قدیم
شدے سنگ در دستِ ابدال سیم
نہ پنداری ایں قول معقول نیست
چو قانع شدی سیم و سنگت یکے ست

یعنی یہ جو مشہور ہے کہ اگلے زمانے میں ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے تھے ، اس میں کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے ، کیونکہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں ان کے نزدیک پتھر اور چاندی میں کچھ فرق نہیں ہوتا ۔ ایک امر خارقِ عادت کو کس حسنِ بیان کے ساتھ کیسے مختصر لفظوں میں عادت کے موافق ثابت کیا ہے ۔

مثال ۲

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست
برِ عارفاں جز خدا ہیچ نیست

تواں گفتن ایں با حقائق شناس
ولے خوردہ گیرند اہلِ قیاس

کہ پس آسمانؑ و زمیں چیستند
بنی آدم و دام و دد کیستند

پسندیدہ پرسیدی اے ہوشمند
بگویم گر آید جوابت پسند

کہ ہامون و دریا و کوہ و فلک
پری ، آدمی زاد و دیو و مَلک

ہمہ ہر چہ ہستند زاں کمتر اند
کہ با ہستیش نامِ ہستی برند

عظیم ست پیش تو دریا بہ موج
بلند ست گردونِ گرداں بہ اوج

ولے اہلِ صورت کجا پے برند
کہ اربابِ معنی بملکے درند

کہ گر آفتاب ست یک ذرّہ نیست
وگر ہفت دریا ست یک قطرہ نیست

چو سلطانِ عزت علم بر کشد
جہاں سر بجیبِ عدم در کشد

یہاں اس نے وحدتِ وجود کے اصلی معنی ، جو کہ اہلِ ظاہر

کی سمجھ سے بالا تر تھے ، نہیں بتائے ، بلکہ اور معنی ، جن کو ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے ، نظم میں ایسی لطافت اور خوبی سے بیان کیے ہیں کہ اور کوئی نثر میں بھی مشکل سے بیان کر سکتا۔

مثال ۳

نگہدار فرصت کہ عالم دمے ست
دمے پیشِ دانا بہ از عالمے ست
سکندر کہ بر عالمے حکم داشت
در آں دم کہ بگزشت و عالم گزاشت
میسّر نبودش کزو عالمے
ستانند و فرصت دہندش دمے

یہاں اس نے دو متضاد دعوے کیے ہیں ؛ ایک یہ کہ عالم ایک سانس کا نام ہے ۔ دوسرا یہ کہ ایک سانس عاقل کے نزدیک تمام عالم سے بہتر ہے ۔ پھر دونوں دعووں کو ایک دلیل سے ثابت کیا ہے کیونکہ جب ایک سانس کے نہ آنے سے تمام عالم سکندر کے ہاتھ سے جاتا رہا تو معلوم ہوا کہ اسی سانس کا نام عالم تھا ، اور جب کہ ایک سانس اس کو تمام عالم کے عوض میں نہ مل سکا تو معلوم ہوا کہ ایک سانس تمام عالم سے بہتر تھا ۔ یہ غایت درجے کا حُسنِ استدلال ہے کہ دو متضاد دعوے ایسی شگفتہ بیانی اور اختصار اور صفائی کے ساتھ ایک ہی دلیل سے ثابت کیے جائیں اور حسنِ شعری بھی ہاتھ سے نہ جائے ۔

۷ ۔ نیچر کے بیان میں شیخ کا کلام فی الواقعہ لاثانی ہے ۔ خدا کی صنعت اور حکمت کے متعلق وہ وہی باتیں بیان کرتا ہے جو سب

جانتے ہیں ، لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو ویسے پاکیزہ اور دل نشیں بیان کے ساتھ ادا کر سکے ۔ اس کے نیچرل بیان پر غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے :

شعر

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مثال ۱

گر از حق نہ توفیقِ خیرے رسد
کے از بندہ خیرے بہ غیرے رسد

زباں را چہ بینی کہ اقرار داد
بہ بیں تا زباں را کہ گفتار داد

درِ معرفت دیدۂ آدمی ست
کہ بکشادہ بر آسمان و زمیست

کیت فہم بودے نشیب و فراز
گر ایں در نہ کردے بروے تو باز

سر آورد و دست از عدم در وجود
دریں جود بنہاد و در وے سجود

وگرنہ کے از دست جود آمدے
محالست کز سر سجود آمدے

بہ حکمت زباں داد و گوش آفرید
کہ باشند صندوقِ دل را کلید

اگر نہ زباں قصّہ برداشتے
کس از سِرّ دل کے خبر داشتے

وگر نیستے سعی جاسوس گوش
خبر کے رسیدے بہ سلطان ہوش

مرا لفظ شیرین خوانندہ داد
ترا سمعِ درّاک دانندہ داد

مدام ایں دو چوں حاجباں بر در اند
ز سلطاں بہ سلطاں خبر مے برند

چہ اندیشی از خود کہ فعلم نکوست
ازاں در نگہ کن کہ تقدیر اوست

برد بوستاں باں بہ ایوانِ شاہ
بہ تحفہ ثمر ہم ز ایوانِ شاہ

اس نظم میں اس نے یہ بات بیان کی ہے کہ بدون خدا کی توفیق کے آدمی سے کچھ نہیں ہو سکتا اور زبان ، کان ، آنکھ ، سر اور ہاتھ ، جن ظاہری اغراض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ، وہ اغراض بیان کی ہیں - یہ تمام باتیں کم و بیش ہر شخص کو معلوم ہوتی ہیں ، مگر جس ترتیب سے شیخ نے ان کو بیان کیا ہے اس کے لحاظ سے تمام مضمون نرالا معلوم ہوتا ہے - اخیر بیت میں انسان کی بندگی اور عبادت کو باغبان کی ڈالی سے ، جو کہ بادشاہ ہی کے باغ میں سے بادشاہ کے لیے لگا کر لے جاتا ہے ، تمثیل دے کر مضمون کا حسن انتہا کو پہنچا دیا ہے -

مثال ۲

دو صد مُہرہ در یک دگر ساختست
کہ کل مہرۂ چوں تو پرداختست
رگت در تنست اے پسندیدہ خوے
زمینے درو سی صد و شصت جوے
بصر در سر و فکر و راے و تمیز
جوارح بدل ، دل بدانش عزیز
بہائم برو اندر افتادہ خوار
تو ہم چوں الف بر قدمہا سوار
نگوں کردہ ایشاں سر از بہر خور
تو آری بعزت خورش پیش سر
نہ زیبد ترا با چنیں سروری
کہ سر جز بطاعت فرود آوری

مثال ۳

شب از بہر آسائش تست و روز
مہ روشن و مہر گیتی فروز
صبا از براے تو فرّاش وار
ہمے گستراند بساط بہار
اگر باد و برفست و باران و میغ
وگر رعد چوگاں زند برق تیغ
ہمہ کارداران فرماں برند
کہ تخم تو در خاک مے پرورند

وگر تشنہ مانی ز سختی مجوش
کہ سقّاے ابر آبت آرد بدوش

ز خاک آورد رنگ و بوے و طعام
تماشا گہِ دیدہ و مغز و کام

عسل دادت از نحل و منّ از ہوا
رُطب دادت از نخل و نخل از نوا

ہمہ نخل بنداں بخایند دست
ز حیرت کہ نخلے چنیں کس نہ بست

خور و ماہ و پرویں براے تو اند
قنادیلِ سقفِ سراے تو اند

ز خارت گُل آورد و از نافہ مشک
زر از کان و برگِ تر از چوبِ خشک

بدستِ خودت چشم و ابرو نگاشت
کہ محرم بہ اغیار نتواں گزاشت

توانا کہ آں نازنیں پرورد
بالوانِ نعمت چنیں پرورد

بجاں گفت باید نفس بر نفس
کہ شکرش نہ کارِ زبانست و بس

۸ - وہ اکثر قانونِ قدرت سے اشیا کے حسن و قبح اور اصولِ اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے اور ایسا استدلال ہمیشہ دیگر اقسامِ استدلال کی نسبت زیادہ دل نشین اور عام فہم ہوتا ہے - کلامِ الٰہی میں بھی مبدا و معاد کے ثبوت پر زیادہ تر اسی قسم کا استدلال کیا گیا ہے -

مثال ۱

پلیدی کند گربہ بر جاے پاک
چو زشتش نماید بپوشد بہ خاک

تو آزادی از ناپسندیدہ ہا
نترسی کہ بر وے فتد دیدہ ہا

بلی کو جو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ وہ جہاں کہیں بول و براز کرتی ہے اس کو فوراً مٹی سے ڈھانک دیتی ہے ، اس سے وہ اس بات پر استدلال کرتا ہے کہ بُرے اعمال کو ہمیشہ لوگوں سے چھپانا چاہیے - جو ایسا نہیں کرتے وہ ایک جانور کے برابر بھی سمجھ نہیں رکھتے -

مثال ۲ - حلمِ شتر چناں کہ معلوم ست - اگر طفلے مہارش گیرد و صد فرسنگ ببرد ، گردن از متابعتِ او نہ پیچد - اما اگر راہے ہولناک پیش آید کہ موجبِ ہلاک باشد و طفل آنجا بنادانی خواہد رفتن زمام از کفش در گسلاند و بیش متابعت نکند کہ ہنگامِ درشتی ملاطفت مذموم ست -

قطعہ

کسے کہ لطف کند با تو ، خاکِ پایش باش
وگر ستیزہ کند در دو چشمش افگن خاک

سخن بلطف و کرم با درشت خوے مگوے
کہ زنگ خوردہ نگردد مگر بسوہن پاک

یہاں اس کو یہ سُجھانا منظور تھا کہ نرمی وہیں تک پسندیدہ ہے جہاں تک دوسری طرف سے درشتی اور سختی اور اپنی مضرّت

کا احتمال نہ ہو ، ورنہ مذموم ہے۔ اس مطلب پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ اونٹ کو بھی قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہیں ہوتا ایک بچہ اس کی نکیل پکڑ کر جہاں تک چاہتا ہے لے جاتا ہے ، مگر جہاں کچھ خوف ہوتا ہے وہاں اس کی اطاعت نہیں کرتا اور رسی توڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

مثال ۳

برہ در یکے پیشم آمد جواں
بہ تگ در پیش گوسفندے دواں
بدو گفتم ایں ریسمانست و بند
کہ می آرد اندر پیت گوسفند
سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد
چپ و راست پوئیدن آغاز کرد
برہ در پیش ہم چناں می دوید
کہ جو خوردہ بود از کف مرد وخید
چو باز آمد از عیش و بازی بجاے
مرا دید و گفت اے خداوند راے
نہ ایں ریسماں می برد با منش
کہ احساں کمندیست درگردنش
بہ لطفے کہ دید است پیل دماں
نیارد ہمے حملہ بر پیل باں
بداں را نوازش کن اے نیک مرد
کہ سگ پاس دارد چو نان تو خورد

بر آں مرد کُند است دندانِ یوز
کہ مالد زباں بر پنیرش دروز

یہاں اس کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس قدر تم لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کرو گے ، اُسی قدر لوگ تمھارے دوست اور خیرخواہ و جاں نثار ہوں گے ۔ اس پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ بکری ، ہاتھی ، کتا ، چیتا اور اسی طرح تمام حیوانات کو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جو شخص ان کی پرورش کرتا ہے اور ان کو کھلاتا پلاتا ہے ، وہ اُسی کا دم بھرنے لگتے ہیں ، یہاں تک کہ وحشیوں میں وحشت اور درندوں میں سبعیّت باقی نہیں رہتی ۔

۹ ۔ وہ کبھی فقیہانہ اور واعظانہ نصیحتیں ، جو اکثر تلخ اور بے مزہ اور سامعین کے دل پر گراں ہوتی ہیں ، نہیں کرتا بلکہ اکثر آزادانہ اور محقّقانہ نصیحتیں کرتا ہے جو اگرچہ عام خیالات سے کسی قدر بلند ہوتی ہیں لیکن حدِّ شرع سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتیں اور اس لیے ان کو زاہد اور رند دونوں پسند کرتے ہیں ۔

مثال ۱

بسرہنگِ سلطاں چنیں گفت زن
کہ خیز اے مبارک درِ رزق زن

برو تا ز خوانت نصیبے دہند
کہ فرزندگانت بسختی درند

بگفتا بود مطبخ امروز سرد
کہ سلطاں بہ شب نیّتِ روزہ کرد

زن از نا امیدی سر انداخت پیش
ہمی گفت باخود دل از فاقہ ریش

کہ سلطاں ازیں روزہ گوئی چہ خواست
کہ افطارِ او عیدِ طفلانِ ماست

خورندہ کہ خیرش برآید ز دست
بہ از صائم الدہر دنیا پرست

مسلّم کسے را بود روزہ داشت
کہ در ماندۂ را دہد نان چاشت

وگرنہ چہ حاجت کہ زحمت بری
ز خود بازگیری و ہم خود خوری

مثال ۲

شنیدم کہ مردے براہِ حجاز
بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز

چناں گرم رَو در طریقِ خدائے
کہ خارِ مغیلاں نکندے ز پائے

بہ آخر ز وسواس خاطر پریش
پسند آمدش در نظر کارِ خویش

بہ تلبیسِ ابلیس در چاہ رفت
کہ نتواں ازیں خوب تر راہ رفت

گرش رحمتِ حق نہ دریافتے
غرورش سر از جادہ برتافتے

یکے ہاتف از غیب آواز داد
کہ اے نیک بخت و مبارک نہاد

مپندار گر طاعتے کردۂ
کہ نُزلے دریں حضرت آوردۂ
بہ احسانے آسودہ کردن دلے
بہ از الف رکعت بہر منزلے

۱۰ - جب اس کو کسی خاص فرقے یا جماعت کے واقعی عیوب بیان کرنے ہوتے ہیں تو ان کو ایسے عمدہ پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتے - مثلاً اس کو یہ منظور تھا کہ امراء اور دولت مندوں کو ان کے عیوب سے مطلع کرے ، تو اس نے اس مطلب کو صاف صاف نہیں لکھا بلکہ ایک فرضی مناظرہ اپنا اور ایک آور شخص کا ، جس میں اپنے تئیں امرا کا طرف دار اور اپنے حریف کو فقرا اور درویشوں کا حمایتی قرار دیا ہے ، لکھ کر تمام دل کے خیالات ظاہر کیے ہیں - طرفِ ثانی امیروں کی برائیاں اور درویشوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور شیخ اس کی تقریر کو رد کر کے امراء کی خوبیاں اور درویشوں کی برائیاں ظاہر کرتا ہے - اسی طرح اس نے تمام سلاطینِ عہد اور وزراء اور امراء کی خاطر خواہ خبر لی ہے - چنانچہ گلستاں کے ساتویں باب میں یہ مناظرہ موجود ہے - یا مثلاً اس کو مشائخ و زہاد کی قلعی کھولنی منظور تھی ، اس مضمون کو اس نے کھلم کھلا ادا نہیں کیا بلکہ ایک قصّہ ، جو کہ بوستاں کے چوتھے باب میں مذکور ہے ، نقل کیا ، جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک شوخ چشم سائل کسی بزرگ کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا - صاحبِ خانہ کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا اس لیے کچھ نہ دیا - سائل نے ڈیوڑھی سے ذرا پرے ہٹ کر اس کی اور اس کے ساتھ تمام فقرا اور مشائخ کی تفضیح اور توہین کرنی شروع کی اور خوب دل کے بخارات نکالے - جتنے واقعی

عیب اکثر ان لوگوں میں ہوتے ہیں وہ سب ظاہر کر دیے۔ جب شیخ صاحب ان کے پترے کھول چکے تو سائل کے بیان کو اپنے اس مقولے پر ختم کرتے ہیں :

نخواہم دریں باب ازیں بیش گفت
کہ شنعت بود سیرتِ خویش گفت

یعنی میں اس باب میں اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا ورنہ وہی مثل ہوگی ''اپنا گُھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے۔'' کیونکہ آپ بھی اسی گروہ میں سے ہیں۔ پھر اس بزرگ کی تواضع اور تحمّل اور حلم کا بیان کیا ہے کہ باوجود ایسی زبان درازیوں کے اس نے کچھ برا نہ مانا اور اس کے گمان سے زیادہ اپنے عیبوں کا اقرار کیا۔

۱۱ - یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ جو واقعات اسلاف سے نقل کیے جاتے ہیں وہ اتنے مؤثر نہیں ہوتے جتنا اپنی سرگزشت اور روداد کا بیان مؤثر ہوتا ہے، بشرطیکہ بیان کرنے والا نہایت فصیح و بلیغ اور اپنے جذبات ادا کرنے پر قادر ہو، کیونکہ جو روایت ایک واسطے سے سنی جاتی ہے اس کا یقین بہ نسبت اُس روایت کے زیادہ ہوتا ہے جو متعدد واسطوں سے سنی جائے۔ دوسرے ناقل اپنی سرگزشت کو بہ نسبت اخبارِ ماضیہ کے زیادہ پُرجوش الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ گلستاں اور بوستاں میں چونکہ شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور ان سے نتائج استخراج کیے ہیں، اس لیے ان کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں، خصوصاً اس وجہ سے کہ شیخ جیسا جادو بیان ان کو بیان کرتا ہے۔ ایسی مثالوں سے دونوں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مثال ۱

بصنعا درم طفلے اندر گزشت
چہ گویم کزانم چہ بر سرگزشت

قضا نقش یوسف جمالے نہ کرد
کہ ماہیِّ گورش چو یونس نخورد

دریں باغ سروے نیامد بلند
کہ بادِ اجل بیخش از بُن نہ کند

عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت
کہ چندیں گل اندام درخاک خفت

بدل گفتم اے ننگِ مرداں بمیر
کہ کودک رود پاک و آلودہ پیر

ز سودا و آشفتگی بر قدش
بر انداختم سنگے از مرقدش

ز ہولم دراں جائے تاریک و تنگ
بشورید حال و بگردید رنگ

چو باز آمدم زاں تغیّر بہوش
ز فرزندِ دلبندم آمد بگوش

گرت وحشت آمد ز تاریک جائے
بہش باش و با روشنیِ در آے

شبِ گور خواہی منوّر چو روز
ازیں جا چراغِ عمل بر فروز

تنِ کارکن سے بلرزد ز تب
مبادا کہ نخلش نیارد رطب

گروہے فراواں طمع ظن برند
کہ گندم نیفشاندہ خرمن برند

براں خورد سعدی کہ بیخے نشاند
کسے برد خرمن کہ تخمے فشاند

۱۲ - جب اُس کو کسی نیک کام کی ترغیب دینی ہوتی ہے تو ایسے غریب اور اجنبی مباحث پیش نہیں کرتا جو لوگوں کے خیالات میں بہت کم گزرتے ہیں ، بلکہ ایسی معمولی باتیں یاد دلاتا ہے جو اس کام کی نسبت ہمیشہ خاص و عام کے دل میں گزرتی اور ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آتی رہتی ہیں اور جب کسی امر پر اس کو متنبہ کرنا منظور ہوتا ہے تو ایسے صریح اور صاف نتیجے سُجھاتا ہے جو دنیا میں ہمیشہ دیکھے جاتے ہیں - وہ کوئی نئی بات نہیں سکھاتا بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے - یہی سبب ہے کہ اس کے بیان کی طرف خود بخود لوگوں کے دل کھنچتے ہیں اور اس کے کلام میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے کوئی مدّت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے آتی ہے اور نہایت رغبت اور شوق سے کھائی جاتی ہے -

مثال ۱

پدر مردہ را سایہ بر سر فگن
غبارش بیفشاں و خارش بکن

چو بینی یتیمے سرافگندہ پیش
مدہ بوسہ بر روے فرزندِ خویش

یتیم ار بگرید که نازش خرد ؟
وگر خشم گیرد که بارش برد ؟

الا تا نگرید که عرشِ عظیم
بلرزد همے چوں بگرید یتیم

به رحمت بکن آبش از دیده پاک
به شفقت بیفشانش از چهره خاک

اگر سایهٔ او برفت از سرش
تو در سایهٔ خویشتن پرورش

من آنکه سرِ تاجور داشتم
که سر در کنارِ پدر داشتم

اگر بر وجودم نشستے مگس
پریشاں شدے خاطرِ چند کس

کنوں گر بزنداں برندم اسیر
نباشد کس از دوستانم نصیر

مرا باشد از دردِ طفلاں خبر
که در طفلی از سر برفتم پدر

مثال ۲

پسر چوں ز ده بر گزشتش سنین
ز نا محرماں گو فراتر نشین

برِ پنبه آتش نشاید فروخت
که تا چشم برہم زنی خانه سوخت

چو خواہی کہ نامت نماند بجاے
پسر را خردمندی آموز و راے

کہ گر عقل و رایش نباشد بسے
بمیری و از تو نماند کسے

بسا روزگارا کہ سختی برد
پسر چون پدر نازکش پرورد

خردمند و پرہیزگارش برار
گرش دوست داری بنازش مدار

بخُردی درش زجر و تعلیم کن
بہ نیک و بدش وعدہ و بیم کن

نو آموز را ذکر و تحسین و زہ
ز توبیخ و تہدیدِ استاد بہ

بیاموز پروردہ را دعتِ رنج
وگر دست داری چو قارون بگنج

مکن تکیہ بر دستگاہے کہ ہست
کہ باشد کہ نعمت نماند بدست

بپایان رسد کیسۂ سیم و زر
نگردد تہی کیسۂ پیشہ ور

چہ دانی کہ گردیدنِ روزگار
بغربت بگرداندش در دیار

چو بر پیشۂ باشدش دسترس
کجا دستِ حاجت برد پیشِ کس

ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت
نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت

بخُردی بخورد از بزرگاں قفا
خدا دادش اندر بزرگی صفا

ہر آں طفل کو جورِ آموزگار
نہ بیند ، جفا بیند از روزگار

پسر را نکو دار و راحت رساں
کہ چشمش نماند بدستِ کساں

ہر آں کس کہ فرزند را غم نخورد
دگر کس غمش خورد و آوارہ کرد

نگہ دار ز آمیزگارِ بدش
کہ بدبخت و بے رہ کند چوں خودش

پسر کو میانِ قلندر نشست
پدر گو زخیرش فرو شوے دست

دریغش مخور بر ہلاکِ و تلف
کہ پیش از پدر مردہ بہ ناخلف

یہ خصوصیتیں جو گلستاں اور بوستاں میں ہم نے بتائی ہیں ، زیادہ غور کرنے سے اور بھی بہت سی باتیں ایسی نکل سکتی ہیں جو ان کتابوں کی مزید شہرت اور قبولیت کا باعث ہوئی ہیں ، مگر ہم انھیں پر اقتصار کر کے اب شیخ کی غزلیات پر نظر ڈالتے ہیں ۔

غزلیاتِ شیخ

غزلیات کی ترتیب کا طریقہ جو فی زمانہ فارسی اور اردو دیوانوں میں مروّج ہے ، اس طریقے پر غالباً سب سے اوّل شیخ ہی کا دیوان مدوّن کیا گیا ہے ، کیونکہ شیخ سے پہلے کے بعض دیوانِ غزلیات ِمثل خاقانی وغیرہ اب تک مجموعۂ قصائد کی طرح غیر مرتّب اور پراگندہ طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں -

علی بن احمد بے ستون ، جامعِ کلیّاتِ شیخ نے اوّل ہر غزل کے مطلع کا حرفِ اوّل لے کر شیخ کے تمام دیوان بہ ترتیب حروفِ تہجی جمع کیے تھے - آخر اس ترتیب میں یہ قباحت نکلی کہ جس غزل کا مطلع معلوم نہ ہو اس کا دیوان میں ملنا دشوار تھا - چنانچہ شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد اُس نے دوبارہ شیخ کے سب دیوان موجودہ طریقے پر مرتّب کیے اور پھر یہ ترتیب عموماً جاری ہو گئی -

شیخ کی غزلیات کے ، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ، چار دیوان ہیں ، جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ طیّبات ہے - باقی تین دیوان اس سے چھوٹے ہیں - اگرچہ ان میں بعض دیوان ابتدائے عمر کے اور بعض سنِّ کہولت اور پیری کے زمانے کے ہیں ، مگر شیخ کا اندازِ بیان ابتدا ہی سے تغزّل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں باعتبار صفائی اور سلاست کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے - شاعر کے کلام میں ہمیشہ

صفائی اور گھلاوٹ ایک مدت کی مشق و مہارت کے بعد آتی ہے - عنفوانِ شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا جیسا سنِ کہولت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے ، مگر شیخ کا کلام اس سے مستثنیٰ ہے - البتہ طیّبات اور بدائع ، جو جوانی اور کہولت کے زمانے کے دیوان ہیں ، ان میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی نزاکت اور زورِ بیان زیادہ پایا جاتا ہے -

شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے ''نمکدانِ شعراء'' لکھا ہے - اگرچہ اس سے پہلے انوری و خاقانی و ظہیر وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں اور قدما کے قصائد میں بھی مثل متاخرین کے اکثر تشبیبوں میں تغزّل یعنی عاشقانہ اشعار ہوتے تھے ، مگر اس وقت غزل میں یہ لذت نہ تھی جو شیخ نے اپنی جادو بیانی سے پیدا کی - پہلے شاعری کا مدار زیادہ‌تر قصیدے اور مثنوی پر تھا - بعضے دو بیتی (یعنی رباعی) اور قطعے کے سوا اور کچھ نہ کہتے تھے -

شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور بامزہ کر دیا کہ لوگ قصیدے اور مثنوی کو چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے - غزل گویوں کے نام یا تو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے یا لاکھوں سے متجاوز ہو گئے - اسی واسطے بعض شعراء نے شیخ کو غزل کا پیمبر کہا ہے - مگر کلام کی نمکینی اور شیرینی محض وجدانی کیفیتیں ہیں جو بدون ذوقِ سلیم کے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتیں - پس صرف یہ کہہ دینا کہ اس کا دیوان نمکدانِ شعراء ہے ، یا وہ غزل کا پیمبر ہے ، انہیں کے لیے کافی ہے جو شعر کا پورا مذاق رکھتے ہیں - ان کے سوا اور لوگ ، جب تک کوئی صریح ما بہ‌الامتیاز شیخ اور قدماء کی غزل میں بیان نہ کیا جائے ، یہ نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی غزل کو کیا فوقیت ہے ، لیکن وجدانیات میں فرق بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے -

میں نے شیخ اور انوری و خاقانی و ظہیر کی غزلیات کو صرف اس غرض سے دیکھا کہ وہ تفاوت جو شیخ اور قدماء کی غزلیات میں ہے صاف صاف معلوم ہو ۔ مجھ کو چند باتیں شیخ کے دیوان میں ایسی ملی ہیں جو قدماء کے کلام میں یا تو بالکل نہیں یا بہت کم پائی جاتی ہیں ۔ میرے نزدیک یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنھوں نے غزل کو نہایت بامزہ اور لطف انگیز اور مرغوبِ طبائعِ خاص و عام کر دیا ہے ۔

۱ ۔ شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزّل اور تغنّی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے ۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ ، جو کہ اکثر اس کو نثر سے زیادہ دلفریب اور دلکش کر دیتا ہے ، وزن اور قافیہ ہے ۔ پس ظاہر ہے کہ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی دلفریبی زیادہ ہو جائے گی ۔ اسی لیے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں ۔ علی ابن احمد ، جامعِ کلّیاتِ شیخ ، جس نے شیخ سے بیالیس برس بعد اس کا کلام جمع کیا ، اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلسِ سماع منعقد تھی جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی :

نظرِ خدائے بیناں ز سرِ ہوا نباشد
سفرِ نیاز منداں ز رہِ خطا نباشد

مجلس کے خاص و عام جا بجا بیہوش اور خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے برخاست ہونے کے بعد سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مدّتِ عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا ۔ میں کہتا ہوں کہ ایک بار میں نے بھی ایک بزرگ کو ، جو سماع سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے ، شیخ کے ایک مطلع پر ، جو قوّال نے بے مزامیر کے ان کے

سامنے گایا تھا ، دیکھا کہ ان کا تمام بدن کانپنے لگا تھا اور آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے اور یہ کیفیت ان پر بہت دیر تک طاری رہی تھی - وہ مطلع یہ تھا :

اے کہ آگاہ نۂ عالمِ درویشاں را
تو چہ دانی کہ چہ سودا و سرست ایشاں را

۲ - شیخ کی غزل کو اس جبلّی عشق و محبت نے ، جو اس کی بات بات سے ٹپکتی ہے ، اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا - عرب اور عجم کے تمام شعراء ، جو عاشق مزاج ہوئے ہیں ، ان کی تشبیب اور تغـزّل میں ایک خاص حالت پائی جاتی ہے جو اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی - چنانچہ شیخ ایک جگہ خود فرماتے ہیں :

آنکہ نشنیدست ہرگز بوے عشق
گو بشیراز آؤ خاکِ ما ببوے

یہی سبب ہے کہ وہ حسن و عشق، وصل و جدائی ، یاس و امید ، صبر و مجبوری ، وعدہ و انتظار اور دیگر لوازمِ عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے ان میں بالکل تصنّع نہیں پایا جاتا ، اور وہ سب باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم میں ہر شخص پر گزرتی ہیں - اسی واسطے عشاق کے دل پر ان کا زیادہ اثر ہوتا ہے - ایسے اشعار سے شیخ کے چاروں دیوان بھرے پڑے ہیں ، مگر چند شعر بطور نمونے کے یہاں لکھے جاتے ہیں :

مقدارِ یارِ ہم نفس چوں من نداند ہیچ کس
ماہی کہ در خشک اوفتد قیمت بداند آب را

اے کہ گفتی ہیچ مشکل چوں فراقِ یار نیست
گر امیدِ وصل باشد آں چناں دشوار نیست

ہر کو ہمہ عمرش سودائے گلے بودہ است
داند کہ چرا بلبل دیوانہ ہمی باشد

دل و جانم بتو مشغول و نگہ بر چپ و راست
تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

دیگراں چوں بروند از نظر از دل بروند
تو چناں در دلِ من رفتہ کہ جاں در بدنے

گفتہ بودم کہ رخت بر بندم
تا رہِ بصرہ گیرم و بغداد
دست از دامنم نمی دارد
خاکِ شیراز و آبِ رُکنا باد

ہزار جہد بکردم کہ سرِّ عشق بپوشم
نبود بر سرِ آتش میسّرم کہ نجوشم
بہ زخم خوردہ حکایت کنم ز دست جراحت
کہ تندرست ملامت کند چو من بخروشم

نفحاتِ صبح دانی ز چہ روے دوست دارم
کہ بہ روے دوست ماند کہ برافگند نقابے

برو اے گداے مسکیں و درے دگر طلب کن
کہ ہزار بار گفتی و نیامدت جوابے

شربتے تلخ تر از دردِ فراقت باید
تا کند لذّتِ وصلِ تو فراموش مرا

بر عندلیبِ عاشق گر بشکنی قفس را
از ذوقِ اندرونش پروائے در نباشد

برقِ یمانی بجست ، بادِ بہاری بخاست
طاقتِ مجنوں نماند ، خیمۂ لیلیٰ کجاست

---

۳ - اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جن سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقع ہے اور وہاں جو حالت اس نے آنکھوں سے دیکھی ہے یا جو کیفیت اس کے دل پر گزری ہے اس کو بیان کر رہا ہے - اس قسم کے اشعار اکثر ایسے موقعوں پر ، جہاں اسی طرح کی کیفیت پیش آتی ہے ، نہایت مزا دیتے ہیں - مثلاً :

اے روبہک چرا نہ نشستی بجاے خویش
با شیر پنجہ کردی و دیدی سزاے خویش

ساربان ! آہستہ ران کارامِ جان در محمل ست
اشتران را بار بر پشت ست و ما را بر دل است

چہ روے است اینکہ پیشِ کاروان است
مگر شمعے بدستِ ساربان است
سلیمان ست گوئی در عماری
کہ بر بادِ صبا تختش روان است
ز روے کارِ من برقع برانداخت
بیک بار آنکہ در برقع نہان است
شتر پیشی گرفت از من برفتار
کہ بر من بیش ازان بارِ گران است
بدار اے ساربان محمل زمانے
کہ عہدِ وصل را آخر زمان است

یار بار افتادہ را در کاروان بگذاشتند
بے وفا یاران کہ بر بستند بارِ خویش را
ہر کرا در خاکِ غربت پاے در گِل ماند ماند
گو دگر در خوابِ خوش بیند دیارِ خویش را

پیوندِ روح میکند این بادِ مشک پیز
ہنگامِ نوبتِ سحر ست ، اے ندیم خیز

شاہد بخوان و شمع بسوزان و گل بنہ
عنبر بسائے و عود و بسوزاں و گل بریز

خادمۂ سرائے را گو درِ حجرہ بند کن
تا بہ سرِ حضور ما رہ نبرد موسوسی

---

۴ - وہ اکثر حالات و واردات کو ، جو اس کے دل پر گزرتے ہیں ، تمثیلات میں بیان کر کے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کر دیتا ہے - اس قسم کی تمثیلات حکیم سنائی اور مولانا روم کے کلام میں بھی بہت پائی جاتی ہے - مثلاً :

بگنجِ شائگاں افتادہ بودم
ندانستم .کہ در گنج اند ماراں

اے برادر ! ما بہ گرداب اندریم
وانکہ شنعت میزند بر ساحل ست

رُطب شیرین و دست از نخل کوتاہ
زلال اندر میان و تشنہ محروم

استادِ کیمیا را بسیار زر بباید
در خاکِ تیرہ کردن تا آنکہ زر بباشد

---

۵ - شیخ کی غزل میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر ایک نزاکت اور چوچلا پایا جاتا ہے، جس سے قدما کی غزل معرّا معلوم ہوتی ہے - وہ ایک سیدھی سی بات کو ہیر پھیر کر ایسے لطیف اور خوشنما پیرائے میں ادا کر دیتا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - وہ سنگریزوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گراں بہا کر دیتا ہے -

بود ہمیشہ پیش ازیں رسمِ تو بیگنہ کُشی
از چہ مرا نمی کشی، من چہ گناہ کردہ ام

خلق را بیدار باید بود زابِ چشمِ من
ویں عجب کاں وقت میگریم کہ کس بیدار نیست

من ندانستم از اول کہ تو بے مہر و وفائی
عہد نابستن ازاں بہ کہ بہ بندی و نپائی
دوستاں عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی
گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم
شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام

اس خاصیت میں شیخ کی غزل سے جو نسبت قدماء کی غزل کو ہے ، اس کا اندازہ شیخ کے چند اشعار کا مقابلہ قدماء کے اشعار کے ساتھ کرنے سے ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ اس مقام پر دو دو شعر خاقانی اور انوری کے اور ان کے ہم مضمون اشعار شیخ کے دیوان سے نقل کیے جاتے ہیں :

انوری

روے چوں ماہِ آسماں داری
قد چو سروِ بوستاں داری

سعدی

سرو را مانی ولیکن سرو را رفتار نیست
ماہ را مانی ولیکن ماہ را گفتار نیست

انوری

ہمہ با من جفا کنند لیکن
بجفا ہیچ ازو نیازارم

سعدی

قادری بر ہرچہ میخواہی بجز آزارِ من
زاں کہ گر شمشیر بر فرقم زنی آزار نیست

خاقانی

بہ رُخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری
بہ رہت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری

سعدی

ہمہ چشمیم تا بروں آئی
ہمہ گوشیم تا چہ فرمائی

خاقانی

شاد باش از حسن خود کز وصفِ تو سحرِ حلال
طبعِ خاقانی بنظم آورد و دیواں تازہ کرد

سعدی

ہر دم از شاخ زبانم میوۂ تر میرسد
بوستانہا رُستہ زاں تخمم کہ در دل کاشتی

۶ - سب سے بڑی بات ، جو شیخ اور قدما کی غزل میں ما بہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اس کے دیوان کو نمکدانِ شعراء کہا گیا ہے ، وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامینِ مندرجہ ذیل پر ہے :

تصوّف اور درویشی - عشقِ حقیقی کو عشقِ مجازی کے پیرائے میں ادا کرنا اور شاہدِ مطلق کے شیون اور صفات کو زلف و خال و خط و لب و دندان وغیرہ سے تعبیر کرنا - کاملین اور عرفا اور مشائخ پر رند ، بادہ خوار ، مے فروش ، پیرِ خرابات وغیرہ کے الفاظ اطلاق کرنے اور ان کے حالات اور واردات کو شراب و نغمہ و دف و چنگ وغیرہ کے لباس میں ظاہر کرنا - سلوک اور فقیری کے مدارج و مقامات یعنی صبر و رضا و تسلیم و توکل و قناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا -

محتسب و زاہد و فقیہ اور ایسے لوگوں پر ، جو مذہب کی رُو سے محلِ ادب ہیں ، طعن و تعریض کرنی اور غیر متشرّع اور آزاد لوگ ، جو از روے مذہب قابلِ توہین و مذمت ہیں ، اُن کی خوبی ظاہر کرنی ۔ دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتانا ۔ ناصحوں کی نصیحت سے نفرت اور رسوائی و بدنامی کی رغبت ظاہر کرنی ۔ عقل و دانش کی جا بجا توہین اور عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ قرار دے کر اس کی تعریف کرنی ۔ ساقی و مطرب کو بار بار پکارنا اور اُن سے شراب و نغمہ کا اس لیے طلب‌گار ہونا کہ دنیا کے تعلقات سے فی‌الجملہ انقطاع میسّر آئے ۔ بادِ صبا اور نسیمِ سحری اور بوے گل کو اکثر مخاطب کرنا اور ان کو قاصد و پیغامبر ٹھہرا کر اپنی آرزوئیں اور مرادیں اور حسرتیں ان سے بیان کرنی وغیرہ وغیرہ ۔ یہ تمام عنوان ہر شخص کو مرغوب ہوتے ہیں ؛ مثلاً عشقِ حقیقی کی واردات اور کیفیات عشقِ مجازی کے پیرائے میں بیان کرنی اور زلف و خال و خط سے شاہدِ مطلق کی شیون اور صفات مراد لینی زیادہ دلکش اور موثّر ہیں ، بہ نسبت اس کے کہ کھلی سورٹھ گائی جائے ، یعنی عشقِ حقیقی کو صاف صاف اس طرح بیان کیا جائے جیسے اکثر ادنیٰ درجے کے شاعر یا موزوں طبع مولوی اور واعظ نظم میں توحید و مناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں ۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں :

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اسی طرح واعظ ، زاہد ، شیخ ، قاضی ، صوفی ، محتسب اور اور ایسے اشخاص کو ، جن کی مذہب میں تعظیم کی جاتی ہے ،

ریاکاری اور مکر اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے لتاڑنا اور رنود و اوباش اور حسن پرست و بادہ خوار لوگوں کو ان کی صاف باطنی ، آزادی اور بے ریائی کی وجہ سے تعریف کرنی ، بہ نسبت اس کے کہ رندوں کی ملامت کی جائے اور متشرّع لوگوں کی تعریف کی جائے ، زیادہ مزیدار ہے اور زیادہ توجہ سے سنا جاتا ہے -

اگرچہ ان میں سے بعض عنوان جستہ جستہ قدماء کی غزل میں بھی پائے جاتے ہیں ، لیکن شیخ کے ہاں اول تو کثرت سے ہیں اور دوسرے اس کے حسنِ بیان نے ان کو بہت بامزہ اور لطف انگیز کر دیا ہے - شیخ کے بعد اول حضرت امیر خسرو اور میر حسن دہلوی نے اس خصوصیت میں شیخ کا تتبع کیا ہے ، کیونکہ شیخ نے اپنے چاروں دیوان ، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ، ملتان میں خان شہید کے پاس ، جس کے ہاں امیر خسرو نوکر تھے ، اپنی زندگی ہی میں بھیج دیے تھے - اس وقت حضرت امیر کی عمر تیس برس سے بھی کچھ کم تھی اور شاعری میں ترقی کرنے کے لیے ان کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا - وہ اگرچہ اور اصنافِ سخن میں ، جیسا کہ مثنوی 'نُہ سپہر'[1] میں لکھتے ہیں ،

---

۱ - 'نُہ سپہر' کے اشعار یہ ہیں :

کس نہ بیند سوے نظمِ دل گیر
کہ نگردد بدلی منزل گیر

چوں نماند بہ دلِ خلقے یاد
گرچہ شد زادہ بہاں داں کہ نزاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۷ پر)

اپنے تئیں شیخ سے بہتر سمجھتے تھے ، مگر شیخ کی غزل کو وہ بھی مانتے تھے ۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں :

خسروِ سر مست اندر ساغرِ معنی بریخت
شیرہ از خم خانۂ مستے کہ در شیراز بود

نیز جس طرح شیخ نے بچپن کے زمانے کی غزلوں کا نام 'غزلیاتِ قدیم' اور جوانی اور کہولت کی غزلیات کا نام 'طیّبات' اور 'بدائع' اور آخر عمر کی غزلیات کا نام 'خواتیم' رکھا ہے ، اسی طرح حضرت امیر نے بھی عمر کے چار زمانوں کے موافق چار دیوان مرتب کیے ہیں : تحفۃالصغر ، وسطالحیٰوۃ ، غُرّۃالکمال ، بقیۂ نقیہ ۔ ان قرینوں کے سوا حضرت امیر کی غزلیات سے بھی صاف پایا جاتا ہے کہ وہ سعدی کے تتبّع سے خالی نہ تھے ۔ امیر خسرو کے بعد خواجہ حافظ شیراز نے بھی غزل کی بنیاد زیادہ تر آنھی خیالات پر رکھی ہے جن کو سب سے اول شیخ نے چمکایا تھا ، مگر ان میں سے بعض مضامین کو خواجہ حافظ نے ایسی رونق دی ہے کہ وہ آنھی کا حصّہ ہو گئے ہیں ۔ جیسے تصوّف ، شراب ، اہلِ ظاہر پر خُردہ گیری ، دنیا کی بےثباتی ، عقل و تدبیر کی توہین ، عشق و

(صفحہ ۲۱٦ کا بقیہ حاشیہ)

تا بجائے کہ حدِ پارسیاں
اندریں عہد دو تن گشت عیاں
زاں یکے سعدی و ثانیش ہمام
ہر دو را در غزل آئین تمام
لیک اگر سوے دگر یازی دست
شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

جوانی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ ۔ اب ہم کچھ غزلیں اور اشعار شیخ کے دیوان میں سے ایسی نقل کرتے ہیں ، جن میں مضامین مذکورۂ بالا زیادہ تر باندھے گئے ہیں :

برخیز تا یک سو نہیم ایں دلقِ ازرق فام را
بر باد قلاشی دہیم ایں شرکِ تقویٰ نام را

مے با جواناں خوردنم خاطر تمنّا می کند
تا کودکاں درپے فتند ایں پیرِ دُرد آشام را

زیں تنگنائے خلوتم خاطر بصحرا می کشد
کز بوستاں بادِ سحر خوش می دہد پیغام را

غافل مباش ار عاقلی ، دریاب اگر صاحب دلی
باشد کہ نتواں یافتن دیگر چنیں ایّام را

جائے کہ سروِ بوستاں با پائے چوبیں می رود
ما نیز در رقص آوریم آں سروِ سیم اندام را

وقتِ طرب خوش یافتیم آں دلبرِ طنّاز را
ساقی بیار آں جام مے ، مُطرب بساز آں ساز را

امشب کہ بزم عارفاں از شمعِ رُویت روشن ست
آہستہ تا نبود خبر رندانِ شاہد باز را

روے خوش و آوازِ خوش دارند ہر یک لذّتے
بنگر کہ لذّت چوں بود محبوبِ خوش آواز را

جاں ندارد ہر کہ جانا نیش نیست
تنگِ عیش ست آنکہ بستانیش نیست

گر دلے داری بہ دلدارے سپار
ضائع آں کشور کہ سلطانیش نیست

ماجرائے عقل پرسیدم ز عشق
گفت ''معزول ست و فرمانیش نیست''

دردِ عشق از تندرستی خوشتر است
گر چہ غیر از صبر درمانیش نیست

چناں بموے تو آشفتہ ام ، ببوے تو مست
کہ نیستم خبر از ہر چہ در دو عالم ست

دگر بروے کسم دیدہ بر نمے باشد
خلیلِ من ہمہ بُت ہاے آذری بشکست

غلامِ ہمتِ آنم کہ پاے بند یکے ست
بجانبے متعلّق شد از ہزار برست

نگاہِ من بتو و دیگراں بخود مشغول
معاشراں ز مے و عارفاں ز ساقی مست

برادران و عزیزاں نصیحتم مکنید
کہ اختیارِ من از دست رفت و تیر از شست

خوشتر از دورانِ عشق ایّام نیست
بامدادِ عاشقاں را شام نیست

مُطربان رفتند و صوفی در سماع
عشق را آغاز ہست ، انجام نیست

از ہزاراں در یکے گیرد سماع
زانکہ ہر کس محرمِ پیغام نیست

ہر کسے را نامِ معشوقے کہ ہست
مے برد ، معشوقِ ما را نام نیست

بادِ صبح و خاکِ شیراز آتشے ست
ہر کہ او در وے گرفت آرام نیست

سعدیا ! چوں بُت شکستی خود مباش
خود پرستی کمتر از اصنام نیست

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ ست
ز عشق تابصبوری ہزار فرسنگ ست

برادرانِ طریقت نصیحتم مکنید
کہ توبہ در رہِ عشق آبگینہ و سنگست

دگر بخفیہ نمے بایدم شراب و سماع
کہ نیک نامی در دینِ عاشقاں ننگ ست

چہ تربیت شنوم یا چہ مصلحت بینم
مرا کہ چشم بساقی و گوش بر چنگ ست

بخشم رفتۂ ما را کہ مے برد پیغام
بیا کہ ما سپرانداختیم اگر جنگ ست

بیادگارِ کسے دامنِ نسیمِ صباح
گرفته ایم و چه حاصل که باد در چنگ ست

بکش چنانکه تو دانی که بے مشاهده ات
فراخنائے جهاں بر وجودِ ما تنگ ست

ملامت از دلِ سعدی فرو نشوید عشق
سیاہی از حبشی چوں رود که خود زنگ ست

دوش بے روئے تو آتش بسرم بر می شد
آبم از دیده همی رفت و زمیں تر می شد

تا به افسوس بپایاں نرود عمرِ عزیز
همه شب ذکرِ تو می رفت و مکرّر می شد

چشمِ مجنوں چو بخفتے همه لیلیٰ دیدے
مدعی بود گرش خواب میسّر می شد

یا رب آں صبح کجا رفت که شبهائے دگر
نفسے میزد و آفاق منوّر می شد

سعدیا ! عقدِ ثریّا مگر امشب بگسیخت
ورنه هر شب ز گریبانِ سحر بر می شد

متقلّبِ درونِ جامۀ ناز
چه خبر دارد از شبانِ دراز

جهد کردم که دل بکس ندهم
چوں تواں کرد با دو دیدۀ باز

محتسب در قفاے رندان ست
غافل از صوفیانِ شاہد باز

از تو با مصلحتِ خویش نمی پردازم
ہمچو پروانہ کہ میسوزم و در پروازم

گر تو خواہی کہ بجوئی دلم امروز بجوے
ورنہ بسیار بجوئی و نیابی بازم

من خراباتی و دیوانہ ام و عاشق و بس
بیشتر زیں چہ حکایت بکند غمّازم

ماجراے دلِ دیوانہ بگفتم بہ طبیب
کہ ہمہ شب درِ چشم ست بفکرت بازم

گفت ازیں نوع شکایت کہ تو داری سعدی
دردِ عشق ست و ندانم کہ چہ درماں سازم

برخیز تا طریقِ تکلّف رہا کنیم
دکانِ معرفت بدو جو پر بہا کنیم

گر دیگر آں نگار قباپوش بگزرد
ما نیز جامہاے تصوّف قبا کنیم

ساقیا ! مے دہ کہ ما دردے کشِ میخانہ ایم
با خرابات آشنا و از خرد بیگانہ ایم

خویشتن سوزیم و جاں بر سر نہادہ شمع وار
ہر کجا در مجلسے شمعے ست ، ما پروانہ ایم

اہلِ دانش را دریں گفتار با ما کار نیست
عاقلاں را کے زیاں دارد کہ ما دیوانہ ایم

خلق میگویند جاہ و فضل در فرزانگی ست
گو مباش اینہا کہ ما رندانِ نافرزانہ ایم

عیبِ تست ار چشمِ گوہر بیں نداری ورنہ ما
ہر یک اندر بحرِ معنی گوہرِ یک دانہ ایم

دو چشمِ مست میگونش ببرد آرامِ ہشیاراں
دو خواب آلودہ بر بوڈند عقل از دستِ بیداراں

نصیحت گوے را از من بگوا ے خواجہ دم در کش
کہ سیل از سر گزشت آں را کہ بے ترسانی از باراں

چہ بوی ست آنکہ عقل از من ببرد و صبر و ہشیاری
ندانم باغِ فردوس ست یا بازارِ عطّاراں

تو با ایں مردمِ کوتہ نظر در چاہِ کنعانی
بمصر آ ، تا پدید آیند یوسف را خریداراں

اے کہ ز دیدہ غائبی ، در دلِ ما نشستہ ای
حسنِ تو جلوہ میکند وین ہمہ پردہ بستہ ای

خاطرِ عام بُردہ‌ای ، خونِ خواص خوردہ‌ای
ما ہمہ صید کردہ ای ، خود ز کمند جستہ ای

مے بر زند ز مشرق شمعِ فلک زمانہ
اے ساقیِ صبوحی در دہ مئے شبانہ

عقلم بدزد لختے چند اختیار دانش
ہوشم ببر زمانے تا کے غمِ زمانہ

صوفی چگونہ گردد گردِ شرابِ صافی
کنجشک را نگنجد عنقا در آشیانہ

آں کوزہ بر کفم نہ کابِ حیات دارد
ہم طُعمِ نار دارد ، ہم رنگِ نار دانہ

گر مے بجاں دہندت ، بستاں کہ پیشِ دانا
ز آبِ حیات خوش تر خاکِ شراب‌خانہ

ہر روز باد مے برد از بوستاں گلے
مجروح می کند دلِ مسکینِ بُلبلے

روے‌ست ماہ‌پیکر و موے‌ست مشکبوے
ہر لالۂ کہ می دمد از خاک و سُنبلے

بالاے خاک ہیچ عمارت نکردہ اند
کز وے بدیر و زود نباشد تحوّلے

مکروہ طلعتے ست جہانِ فریب ناک
ہر بامداد کردہ بشوخی تجمّلے

دی بوستانِ خرّم و صحرا و لاله زار
وز بانگِ مُرغ در چمن افتاده غلغلے
وامروز خارہاے مغیلاں کشیده تیغ
گوئی که خود نبود دریں بوستاں گلے
دنیا پُلے ست رہگذرِ دارِ آخرت
اہلِ تمیز خانه نگیرند بر پُلے

اے که آگاه نه ای عالمِ درویشاں را
توچه دانی که‌چه سودا و سرست‌ایشاں‌را
گنجِ آزادگی و کنجِ قناعت ملکے ست
که به شمشیر میسر نه شود سلطاں را
طلبِ منصبِ فانی نکند صاحبِ عقل
عاقل آنست که اندیشه کند پایاں را
جمع کردند و نهادند و بحسرت رفتند
ویں چه دارد که بحسرت نگزارد آں را
در ازل بود که پیمانِ محبت بستند
نشکند مرد اگرش سر برود پیماں را
عاشقے سوختۀ بے سر و ساماں دیدم
گفتم اے یار مکن در سرِ فکرت جاں را
نفسے سرد برآورد و ضعیف از سرِ درد
گفت بگزار منِ بے سر و بے ساماں را
پندِ دلبندِ تو در گوشِ من آید ہیہات
منکه بر درد حریصم چه کنم درماں را

سعدیا ! عمر عزیزست بغفلت مگزار
وقتِ فرصت نشود فوت مگر نادان را

لا آبالی چه کند دفترِ دانائی را
طاقتِ وعظ نباشد سرِ سودائی را
دیده را فائده آنست که دلبر بیند
ور نه بیند ، چه بود فائده بینائی را
همه دانند که من سبزهٔ خط دارم دوست
نه چو دیگر حیوان سبزهٔ صحرائی را
سعدیا نوبتے امشب دہلِ صبح نکوفت
یا مگر صبح نباشد شبِ تنہائی را

شبے و شمعے و گویندهٔ و زیبائے
ندارم از همه عالم جز این تمنائے
فرشته رشک برد بر جمالِ مجلسِ من
گر التفات کند چون تو مجلس آرائے
ضرورتست بلا دیدن و جفا بردن
ز دستِ آنکه ندارد بحسن همتائے
قیامت ست که در روزگار ما برخاست
به راستی که بلائے ست آں نه بالائے
دگر چه بینی اگر رُو ازو بگردانی
که نیست خوشترازو در جهان تماشائے

وگر کنی نظر از دور کن کہ نزدیکست
کہ سر ببازی اگر پیشتر نہی پاے

عالم کہ عارفاں را گوید نظر بدوزند
گر یارِ ما بہ بیند صاحب نظر بباشد

زیرا کہ پادشاہے چوں بقعۂ بگیرد
بنیادِ حکمِ اول زیر و زبر بباشد

دیوانہ را کہ گوئی ہشیار باش و عاقل
ترسم کہ از نصیحت دیوانہ تر بباشد

ساقی بیار جاسے مطرب بگوے چیزے
لب بر دہانِ نے نہ تا نیشکر بباشد

ببوے زلف تو با باد عیش‌ہا دارم
اگرچہ عیب کنندم کہ باد پیمائیست

ترا ملامتِ سعدی حلال کے باشد
کہ بر کناری و او درمیانِ دریائیست

الغرض شیخ سے پہلے تغزّل کا میلان زیادہ تر عشقِ مجازی کی طرف تھا اور عشقِ مجازی کے متعلق بھی صرف وہ بیرونی اور ظاہری حالتیں بیان کی جاتی تھیں جو عام عشق بازوں کی زبان پر جاری ہوتی ہیں۔ شیخ نے اپنی غزل میں ایسی باتیں کم لکھی ہیں، بلکہ وہ اکثر عشق و محبت کے پوشیدہ اسرار و غوامض اور عمیق

کیفیّات اور اندرونی حالات بیان کرتا ہے، جو دل بستگی کے زمانے میں ہر انسان پر گزرتے ہیں، لیکن ہر شخص ان کو بیان نہیں کر سکتا، بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گزر رہا ہے۔ مثلاً یہ بات عشق بازوں اور بوالہوسوں کے زبان زد ہوتی ہے کہ معشوق کی جدائی ایسی سخت چیز ہے جو کسی طرح اور کسی حالت میں برداشت نہیں کی جا سکتی، لیکن یہ بات عام نظروں سے مخفی ہوتی ہے کہ وصل کی آمید پر جدائی بسر کرنی ایسی مشکل نہیں ہے جیسی خیال کی جاتی ہے، جیسا کہ شیخ کہتا ہے:

اے کہ گفتی ہیچ مشکل چوں فراقِ یار نیست
گر آمیدِ وصل باشد آں چناں دشوار نیست

یا مثلاً جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور باوجود کمال اشتیاق کے وصل سے بہرہ مند نہیں ہوتے، وہ عموماً عشق و محبت کی قید سے آزاد ہونے کی آرزوئیں کیا کرتے ہیں اور اس موقع کو یاد کر کر کے پچتاتے ہیں جب کہ دل بستگی کے سامان انھوں نے خود مہیا کیے تھے اور بار بار صورت دیکھنے یا باتیں سننے یا ربط بڑھانے سے ایک مردہ چنگاری کو زیادہ افروختہ کیا تھا، لیکن ان کو یہ شعور بہت کم ہوتا ہے کہ اس جلن اور سوزش میں کس قدر لـذّت چھپی ہوئی ہے اور یہ کہ اگر بالفرض ترکِ عشق و محبت پر ان کو اختیار دے دیا جائے تو وہ ہرگز اس دلّ بند قید سے چھوٹنا گوارا نہیں کر سکتے، جیسا کہ شیخ نے کہا ہے:

بر عندلیبِ عاشق گر بشکنی قفس را
از ذوقِ اندرونش پروائے در نباشد

یا مثلاً عـشّاق کا عام خیال یہ ہے کہ معشوق کے دیکھنے

سے کبھی جی سیر نہیں ہوتا اور جب تک وہ سامنے رہتا ہے ، عاشق اس کے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا ۔ مگر یہ بات بہت کم خیال میں گزرتی ہے کہ عشّاق کو بسا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ باوجود کمال اشتیاق کے معشوق کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے ، جیسا کہ شیخ کہتا ہے :

دل و جانم بتو مشغول و نگہ بر چپ و راست
تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

یا مثلاً عشّاق کا عام خیال یہ ہے کہ دوست سے جب مدت کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو وہ وقت شکوہ و شکایت اور جدائی کی مصیبتیں بیان کرنے کا ہوتا ہے ، مگر اس واقعی کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ جب دوست سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کے ملنے کی خوشی میں اکثر تمام شکوے اور جدائی کے صدمے یک قلم فراموش ہو جاتے ہیں ، چنانچہ شیخ نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے :

گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

غرض کہ ایسے گہرے خیالات سے قدماء کی غزل بالکل معرّا تھی ۔ اول شیخ نے ان مضامین کی بنیاد ڈالی ہے ۔ تصوف و درویشی وغیرہ کے مضامین نے غزل میں اور بھی زیادہ لذّت اور نمک اور درد بھر دیا ۔ جن اصول پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی ، اس کے بعد اکثر متغزّلین نے وہی اصول اختیار کیے ، کیونکہ ان کے بغیر غزل کا سرسبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران اور ترکستان اور ہندوستان میں ایک آگ سی لگ گئی ۔ ہر موزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گویوں کی

تعداد حساب اور شمار سے زیادہ بڑھ گئی - ازاں جملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا - علی الخصوص خواجہ حافظ شیراز کی غزل نے اپنا وہ سکّہ بٹھایا کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے ، یا فقر و درویشی کی چاشنی سے با خبر تھے ، یا راگ راگنی سے آشنا تھے ، یا شراب و کباب کا چسکا رکھتے تھے ، یا عاشق مزاج اور عیش دوست تھے ، سب جان و دل سے اس پر قربان ہو گئے- رقص و سرود کی محفلوں میں ، حال و قال کی مجلسوں میں ، قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں ، شعراء کی صحبتوں میں ، مشائخ کے حلقوں میں ، در و دیوار سے ، لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی -

اس میں کچھ شک نہیں کہ شیخ کی غزل نے فارسی شاعری میں ایک خاص قسم کی وسعت پیدا کی ، جس کے سبب سے قدرتی جذبات کا ایک طویل الذّیل باب یعنی عشق و محبت وغیرہ کے مضامین نہایت آب و رنگ کے ساتھ بیان کیے گئے ، مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ اس بادۂ ہوش ربا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق ، خیالات اور معاشرت پر کچھ اچھے ثمرے مترتّب نہ ہوئے- شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو اور خواہ اخلاقی ، ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں ہمیشہ پڑھے اور گائے جاتے ہیں ، وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلا شعور نہیں ہوتا - اور جس قدر شعر میں نمک اور حسن زیادہ ہوتا ہے ، اسی قدر اس کی تاثیر جلد اور پائدار ہوتی ہے - شیخ سعدی ، خواجہ حافظ ، امیر خسرو ، میر حسن سجزی ، مولانا جامی وغیرہم کی غزلیں ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ، ممالکِ اسلامیہ کے ایک بڑے حصے میں عموماً پڑھی اور گائی جاتی ہیں - اگرچہ ان بزرگواروں

کا کلام زیادہ‌تر حقائق اور معارف اور سلوک اور تصوف پر مبنی ہے ، لیکن اس میں مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں - جس طرح اس سے ایک صوفیِ خدا پرست روحانی کیفیت اُٹھاتا ہے ، اسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی جذبات اس کے سننے اور پڑھنے سے بر انگیختہ ہوتے ہیں - سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں - وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے - عشقِ حقیقی کے ساتھ عشقِ مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے - مال و دولت ، علم و ہنر ، نماز روزہ ، حج زکواۃ ، زہد و تقویٰ غرضیکہ کسی شے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی - وہ عقل و تدبیر ، مآل اندیشی ، تمکین و وقار ، ننگ و ناموس ، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آوارگی ، رسوائی ، بدنامی ، بدمستی ، بےسروسامانی وغیرہ کو ، جو عشق کی بدولت حاصل ہو ، تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے - دولتِ دنیا پر لات مارنا ، عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا ، توکل اور قناعت کے نشے میں اپنی ہستی کو مٹانا اور جوہرِ انسانیت کو خاک میں ملا دینا ، دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصوّر باندھے رکھنا ، علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجابِ اکبر جاننا ، حقائقِ اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا ، کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا اور جو کچھ ہاتھ لگے اس کو فوراً رائگاں کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں - ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطّبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقّاصہ کی خوش آوازی

اور حسن و جمال اور مزامیر کی لَے ان کو لے اڑتی ہے اور ان کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ اس کلام کے قائل اکابرِ صوفیہ اور مشائخِ کرام ہیں، جن کی تمام عمر حقائق و معارف کے بیان کرنے میں گزری ہے اور جن کا شعر شریعت کا لبِ لباب اور طریقت کا رہنما اور عالمِ لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دل نشیں ہوتے ہیں ۔ پس ممکن نہیں کہ شیخ اور اس کے متّبعین کی غزل نے سوسائٹی کو اپنے جادو سے اچھوتا چھوڑا ہو ۔ اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو اکثر ان صفات سے موصوف پاتے ہیں جن کی اس مجموعۂ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے ۔ عشق بازی، حسن پرستی ان کے ساتھ اس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف دولت مند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اس کا چسکا رکھتے ہیں، اور نہ صرف نوجوان بلکہ معمّر لوگ بھی اس کا دم بھرتے ہیں ۔ فضول خرچی، ناعاقبت اندیشی، عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا، توکل اور قناعت کے دھوکے میں معاش کی کچھ فکر نہ کرنی، غیر قوموں کی ترقی کا ذکر سن کر دنیا و مافیہا کو ہیچ و پوچ بتانا، عقلِ انسانی کو حقائقِ اشیاء کے ادراک سے عاجز جاننا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک دھوکا سمجھنا وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی خاصیتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں ۔ اگرچہ یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیتیں اسی شعر و غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں، شاید اس کے اصلی سبب کچھ اور ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوفانہ اشعار نے اس حالت کے ترقی دینے میں بہت کچھ مدد پہنچائی ہے ۔

سٹیون صاحب نے جو کلکتہ ریویو مورخہ جون سنہ ۱۸۵۶ع

میں خواجہ حافظ کا حال لکھا ہے ، اس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے ، جس کا نقل کرنا اس مقام پر شاید بے موقع نہ ہوگا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

''سعدی ، جو کہ حافظ کا چچا ہے ، ایک روز وہ اور حافظ کسی جگہ بیٹھے تھے اور سعدی غزل لکھ رہا تھا جس کا پہلا مصرع حافظ کی بھی نظر پڑ گیا ۔ اتفاقاً اس وقت سعدی کسی کام کے لیے وہاں سے اٹھ گیا اور اپنی غزل کا کاغذ ساتھ لے گیا ۔ حافظ نے اس مصرعے پر دوسرا مصرع لگا کر اور پوری بیت ایک پرچے پر لکھ کر وہاں چھوڑ دی . . . . . . اور آپ چل دیا ۔ شیخ نے پھر وہاں آ کر حافظ کو نہ پایا مگر وہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس میں سعدی پر کچھ چوٹ کی تھی ۔ سعدی اس بات سے ناخوش ہوا اور حافظ کو بلا کر پوچھا کہ یہ شعر تونے لکھا ہے ؟ اس نے کہا ہاں ۔ شیخ نے اس سے ساری غزل پوری کرائی اور جب وہ غزل سنی تو اس کو بد دعا دی کہ جو شخص تیری غزل پڑھے گا وہ عقل سے بیگانہ رہے گا ۔''

اس کے بعد صاحبِ موصوف لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے اکثر شیعی مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ بے شک سعدی کی بد دعا حافظ کے حق میں مستجاب ہوئی ، کیونکہ اس کے ہر ایک شعر میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے ۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ :

''یہ حکایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حافظ کی غزل سے دیوانگی اور وحشت پیدا ہوتی ہے ۔'' میں کہتا ہوں کہ یہ خیال تو شاید غلط نہ ہو مگر یہ حکایت قطعی غلط ہے ، کیونکہ شیخ اور خواجہ کی وفات میں پورا ایک صدی

کا آگا پیچھا ہے'۔ قسطنطنیہ کے شیعوں کا خیال میرے نزدیک اس اعتبار سے صحیح ہے کہ خواجہ حافظ کی غزل کی مُمارست اور مُزاولت سے بے شک ابرار و احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے اور اوباش و الواط کو بے فکری، ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی و رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔ ہر زمانے کا جدا جدا اقتضا ہوتا ہے۔ جب دولت مند اور ذی اقتدار لوگ دنیا طلبی اور حُبِّ جاہ میں سراسر منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور جسمانی خوشیوں میں محو ہو کر روحانی مسرتوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور عقل و شریعت کے احکام معطل ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں، اس وقت البتہ یہ امید ہو سکتی ہے کہ ایسی ترغیبوں سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو، لیکن ایسی حالت میں جب کہ تمام قوم کم ہمت اور پست حوصلہ ہوگئی ہو اور اولوالعزمی کا تخم ان کی طبیعت میں جل گیا ہو، اور جب کہ تمام دنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجہ ہوں، اس وقت دنیا سے ان کا دل سرد کرنا اور قناعت اور توکل کا ان کو سبق پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسا ٹمٹماتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اس کو گل کر دینا۔ پس ممکن ہے کہ شیخ اور اس کے متّبعین کی غزل نے اس زمانے میں، جب کہ مسلمانوں کے دماغ میں نشۂ جاہِ دنیوی عروج پر تھا، کچھ مفید نتائج پیدا کیے ہوں، لیکن اِس زمانے میں میرے نزدیک اس سے

۱۔ سعدی کا انتقال ۶۹۱ ہجری (مطابق ۱۲۹۲ع) میں ہوا اور حافظ کی وفات ۷۹۲ ہجری (۱۳۸۹ع) میں ہوئی۔ (اسماعیل پانی پتی)

ضرر کا اندیشہ ہے -

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شیخ اور حافظ کی غزل پر کچھ اعتراض کرنا مقصود ہے بلکہ اس سے ان کی کمال سحر بیانی اور سیف زبانی ثابت ہوتی ہے - شاعر کا کمال یہی ہے کہ جو کچھ وہ کہے اس سے لوگ متاثر ہوں ، نہ یہ کہ اس سے کبھی مضر نتائج پیدا نہ ہونے پائیں - بازوت نے باوجودیکہ بنی آدم کی ہزاروں جانیں تلف کی ہیں اور شراب نے بے شمار آدمیوں کو اخلاقی اور جسمانی مضرتیں پہنچائی ہیں ، با ایں ہمہ ان کے موجدوں کی دانش مندی کا تمام دنیا اعتراف کرتی ہے اور کرے گی -

قصائد وغیرہ

اس مجموعے میں شیخ کے مدحیہ قصیدے ، مرثیے ، ترجیع بند ، مُلمع اور مثلّث جمع کیے گئے ہیں - یہ مجموعہ غزلیات کی نسبت بہت تھوڑا ہے - شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی - یا تو اس کی طبیعت ہی قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گوں نہ تھی اور یا اس نے مدح و ستائش کے طریقۂ مروجہ کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا ، مگر چونکہ اُس زمانے کے دستور کے موافق ایک ایسے نامور شاعر کو ، جیسا کہ شیخ تھا ، کچھ نہ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا ، اس لیے اس نے کسی قدر قصائد لکھے ہیں جو کہ پہلے قصیدہ گویوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں -

شیخ سے پہلے جو حالت قصیدہ گوئی اور مدّاحی کی مسلمانوں میں تھی ، اُس کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں محل نہیں ہے ، مگر مختصر یہ ہے کہ منصور بن مہدی عبّاسی خلیفۂ بغداد کے زمانے سے شعراء کو نہایت گراں بہا صلے اور انعام ملنے لگے تھے - ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ درہم شاعروں کو مل جاتے تھے - خلفاء اور امراء کو اپنی تعریفیں سننے کا ایسا شوق ہوگیا تھا کہ ان کا مدّاح کسی اور شخص کی مدح میں زیادہ مبالغہ کرتا تھا تو ان کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور اگر شاعر تشبیب میں زیادہ شعر لکھ لاتا تو شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ طبیعت کا سارا زور تو خال و خط کی تعریف میں خرچ کر دیتے ہیں ، صرف کچھ بچے کھچے خیالات

ہمارے سر مارتے ہیں - ہزاروں علماء و فضلا نے قصیدہ گوئی اور مدّاحی کو اپنا پیشہ ٹھہرا لیا تھا اور شاعری میں شہرت ہو جانے کے بعد کسی کو اس بات سے چارہ نہ تھا کہ ذی اقتدار لوگوں کی مدح سرائی میں خامہ فرسائی کرے - شعراء تمام ممالکِ اسلامیہ میں اس امید پر سفر کرتے تھے اور قصیدہ گوئی کی بدولت اطراف و جوانب سے مال و دولت جمع کر کے لاتے تھے - عبّاسیوں کے علاوہ فاطمی ، دیلمی ، کُردی ، طاہری ، صفاری ، سامانی ، غزنوی ، سلجوقی ، خوارزم شاہی وغیرہ تمام سلسلوں میں مدّاحوں کی نہایت قدر کی جاتی تھی - ایران میں بھی سامانیوں کے عہد سے پہلے تو عربی قصائد ہی کا زور شور رہا مگر سامانیوں کے زمانے میں ایران کی شاعری کا مدار زیادہ تر فارسی زبان پر آ ٹھہرا - فارسی قصیدے نے بھی خوب رواج پایا - ظہیر ، رشید ، خاقانی اور انوری وغیرہم نے فارسی قصیدے میں وہی شہرت حاصل کی جو عربی میں مُتنبّی ، ابوتمّام ، بحتری اور ذوالرمہ نے حاصل کی تھی -

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ سعدی جیسے مشہور شاعر کو سلاطین و امرائے عہد کی تعریف میں قصیدہ لکھنا ایسا ہی ضروری تھا جیسے درباریوں کو جشن اور تہوار میں نذر دکھانا ، مگر قصیدے کی حالت اس وقت ایسی بری تھی کہ شیخ کو اپنی جبلّی استقامت اور سنجیدگی کے سبب اس روش پر چلنا دشوار تھا - ممدوح کی ستائش میں سراسر عقل و عادت کے خلاف مبالغے کیے جاتے تھے ، الفاظ کی سادگی اور بے تکلفی قصائد میں مذموم سمجھی جاتی تھی ، مسائلِ علمیّہ اور مقدماتِ حکمیّہ اور سلوک و تصوّف کے دقائق اور علومِ مختلفہ کی اصطلاحیں اظہارِ علم و فضل کے لیے ان میں بالقصد داخل کی جاتی تھیں - صنائع لفظی، خصوصاً تجنیس و ترصیع وغیرہ کو ان کا زیور سمجھتے تھے - شیخ کی آزادی اور حق گوئی

خصوصاً سادہ بیانی ، جو اس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی ، ان تکلّفاتِ لایعنی سے مانع تھی ۔ اس کے کلام سے جا بجا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مبالغے اور خوشامد کو نہایت ناپسند کرتا تھا ۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلاں کی مدح میں ایک جگہ یہ شعر لکھا ہے :

'نہ کرسیِ فلک نہد اندیشہ زیر پائے
تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دہد

شیخ بوستاں میں جہاں اتابک ابوبکر سعد کی تعریف لکھتا ہے ، وہاں ظہیر کے اس شعر پر اس طرح تعریض کرتا ہے :

براہِ تکلّف مرو سعدیا !
اگر صدق داری بیار و بیا

تو منزل شناسی و شہ راہرو
تو حق گو و خسرو حقائق شنو

چہ حاجت کہ 'نہ کرسیٔ آسماں
نہی زیر پائے قزل ارسلاں

مگو پائے عزت بر افلاک نہ
بگو روئے اخلاص بر خاک نہ

اس کے سوا اور اکثر جگہ اس نے مداح پیشگی سے نفرت اور اعراض ظاہر کیا ہے ۔ اس کے ایک قطعے کا یہ مضمون ہے کہ ''لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اے سعدی ! تو کیوں سختیاں اٹھاتا ہے اور کیوں اپنے کمالِ شاعری سے متمتع نہیں ہوتا ؟ اگر تو مدح گوئی اختیار کرے تو نہال ہو جائے ۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی رئیس یا امیر کے دروازے پر اپنا مطلب دریوزہ‌گروں کی

طرح لے جاؤں ۔ اگر ایک جو بھر ہنر کے عوض میں کوئی مجھ کو سو خزانے بخش دے تو وہ مستحق شکر ہے اور میں قابلِ نفرین ۔"

شیخ کو قطع نظر اس کے کہ مبالغے اور خوشامد سے نفرت تھی ، کوئی ضرورت بھی ایسی داعی نہ تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اگلی بھیڑوں کے پیچھے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہو جاتا اور قصیدہ گوئی کا ، جو اُس وقت کمال سمجھا جاتا تھا ، اس کے حاصل کرنے میں مقتضاے طبیعت کے خلاف کوشش کرتا ۔ وہ سلطانی خدمات سے ہمیشہ متنفّر رہتا تھا اور اپنے دوستوں کو اس سے باز رکھنے میں کوشش کرتا تھا ۔ پس اس کو اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ قصیدے کو مقبولِ خاص و عام بنائے اور اس ذریعے سے دربار میں تقرّب حاصل کرے ۔ جتنے نامی قصیدہ گو ایران میں گزرے ہیں سب بادشاہوں کے ہاں اس خدمت پر مامور رہے ہیں کہ تقریبوں میں طوفان کے تودے بنا کر لائیں اور ان میں جس قدر زیادہ مبالغے اور جھوٹ کو کام فرمائیں اسی قدر گراں بہا صلے اور انعام پائیں ۔ چنانچہ ظہیر ، قزل ارسلان کے ہاں ، انوری ، سلطان سنجر کے ہاں ، رشید وطواط ، خوارزم شاہ آتسنر کے ہاں اور خاقانی ، شروان شاہ کے ہاں ملک الشعراء تھے ۔ ان لوگوں کی تمام طاقت اور لیاقت قصیدہ گوئی میں صرف ہوتی تھی اور ان کی ترقی اور تقرّب کا مدار صرف ان باتوں پر تھا جو اُس زمانے میں قصیدہ گوئی کے لیے ضروری تھیں ۔ یہی سبب ہے کہ قصیدے کے سوا کوئی بڑی یادگار انھوں نے نہیں چھوڑی ۔

پس اگرچہ شیخ جیسے مشہور اور نامور شاعر کو اُس زمانے کے دستور کے موافق کچھ نہ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا ، لیکن اس کو ویسے جھوٹے اور نمائشی طلسم باندھنے کچھ ضرور نہ تھے ، جیسے کہ انوری اور ظہیر وغیرہ نے باندھے ہیں ۔ اسی لیے

غلطی سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شیخ کو قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا۔ میں ہرگز اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ اس کو معمولی چمک دمک کے ساتھ قصیدہ لکھنے پر قدرت نہ تھی ، بلکہ میرے نزدیک جس طرح رُولر ٹیڑھا خط کھینچنے سے مانع ہوتا ہے اسی طرح طبیعت کی استقامت کبھی بے راہ نہیں چلنے دیتی۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی میں جس قدر قصیدہ حدِّ شاعری سے متجاوز ہو گیا ہے ، ایسی اور کوئی صنف نہیں ہوئی۔ مدحیّہ قصائد سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہیے کہ ممدوح کی صفات سن کر خاص و عام کے دل میں اس کی محبت اور اس کے ساتھ حسنِ ظن پیدا ہو اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیے کہ اگر وہ صفتیں اس میں موجود ہوں تو ان میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم ان کو اسی حال پر قائم رکھے، اور اگر نہ ہوں تو ان کے حاصل کرنے میں کوشش کرے۔ یہ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو صفات مدح میں ذکر کی جائیں ، وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی الواقعہ موجود ہوں یا ان کے موجود ہونے کا احتمال ہو۔ ورنہ ممدوح کے دل میں اس مدح کی وقعت ایک ہجوِ ملیح سے زیادہ نہ ہوگی۔ مثلاً ظہیر فاریابی نے جو قزل ارسلاں کی مدح میں یہ لکھا ہے کہ ''تصور جب ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی کو طے کر لیتا ہے ، تب جا کر قزل ارسلاں کی رکاب پر بوسہ دیتا ہے'' اس سے قزل ارسلاں کے دل پر اس کے سوا کہ اس کو ایک ہجوِ ملیح سمجھا ہو ، اور کیا اثر ہوا ہوگا۔ یا مثلاً انوری جو مجدالدّین ابوالحسن کی شان میں لکھتا ہے کہ ''اگر وہ زمانۂ گزشتہ کو رجعت کا حکم دے تو پھر کر زمانۂ آئندہ کی جگہ آ جائے'' اس سے ابوالحسن کے دل میں سوا اس کے کہ مدّاح مجھ کو بناتا ہے یا میرا خاکہ اڑاتا ہے ، اور کیا خیال گزرا ہوگا۔ یہی حال ان تمام قصیدہ گویوں کی مدح کا ہے جن کو ایران

اور ہندوستان وغیرہ میں سب نے تسلیم کیا ہے - شیخ نے نہ عدم قدرت کے سبب بلکہ فرطِ کراہت کے سبب مدح و ستائش کے اس ناپسندیدہ طریقے کو اختیار نہیں کیا - اس نے قصائد بھی اپنی اسی شیریں زبانی اور سادہ بیانی و بے تکلفی کے ساتھ ، جو کہ اس کے کلام کی عام خاصیت ہے ، لکھے ہیں - اس کے قصائد سے کمال آزادی اور حق گوئی ثابت ہوتی ہے - اس نے اکثر قصیدے اور ترجیع بند وغیرہ محض محبت اور خلوص اور دلی جوش سے لکھے ہیں ، نہ خوشامد کی راہ سے ، اور نہ صلہ و انعام کی اُمید پر - باقی جس قدر قصیدے بضرورت سلاطینِ عہد اور حکامِ وقت کی شان میں لکھے ہیں ان کے اسلوبِ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے اہلِ دنیا کی تنبیہ اور نصیحت و پند کے لیے قصیدے کو ان سے خطاب کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا ، کیونکہ وہ بالکل مواعظ و نصائح سے بھرے ہوئے ہیں - بعض قصیدوں میں پند و اندرز کے سوا مدحیہ اشعار دو چار سے زیادہ نہیں ہیں - یہ وہ قصیدے ہیں جو اس نے اپنے دوست اور معتقد امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ نامزد کیے ہیں - ان کے سوا اَور قصیدوں میں اول مدح و ستائش کی چاٹ دے کر ، پھر نصیحت کرنی شروع کی ہے -

شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ اور اس کی علتِ غائی جو اس نے قرار دی تھی ، ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتی ہے -

اتابک ابوبکر بن سعد زنگی ، جو فارس کا بادشاہ تھا اور شیخ اس کی رعایا میں سے تھا ، اُس کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے :

بنوبت اند ملوک اندریں سپنج سرائے
کنونکہ نوبتِ تست اے ملک بعدل گرائے

چہ مایہ بر سرِ ایں ملک سروراں بودند
چو دورِ عمر بسر شد در آمدند از پاے

نیاز باید و طاعت نہ شوکت و ناموس
بلند بانگ چہ سود و میان تہی چو دراے

بہ تیغ و نیزہ گرفتند جنگجویاں ملک
تو برّ و بحر گرفتی بعدل و ہمت و راے

چو ہمت ست چہ حاجت بہ گُرزِ مغفر کوب
چو دولت ست چہ حاجت بہ تیر جوشن خاے

عمل بیار کہ رختِ سراے آخرت ست
نہ عود سوز بکار آیدت نہ عنبر ساے

ہر آں کست کہ بہ آزارِ خلق فرماید
عدوے مملکت ست آں، بکُشتنش فرماے

بکامۂ دلِ دشمن نشیند آں مغرور
کہ بشنود سُخن دشمناں دوست نماے

دیارِ مشرق و مغرب بگیر و جنگ مجوی
دلے بدست کن و زنگ خاطرِ بزداے

نگویمت چو زباں آورانِ رنگ آمیز
کہ ابرِ مُشک فشانی و بحر گوہر زاے

نکاہد آنچہ نوشتہ ست عمر و نفزاید
پس ایں چہ فائدہ گفتن کہ تا بہ حشر بپاے

دوسرے قصیدے میں چند مدحیّہ شعر لکھ کر اتابک ابوبکر کی طرف اس طرح خطاب کرتا ہے:

مدیحِ شیوهٔ درویش نیست تا گویم
کہ ہمچو بحرِ محیطی و ابرِ آذاری

نگویمت کہ بفضل از کرام ممتازی
نگویمت کہ بعدل از ملوک مختاری

وگرچہ این ہمہ ہستی نصیحت اولی‌تر
کہ پندِ راہِ خلاص ست و دوستی یاری

بسعی کوش کہ ناگہ فراغتت نبود
کہ سر بخاری ، اگر روے شیر نر خاری

خداے یوسفِ صدیق را عزیز نہ کرد
بخوبروئی و لیکن بخوب کرداری

شکوہِ لشکر و جاہ و جلال و مالت ہست
ولے بکار نیاید بجز نکو کاری

بقاے مملکت اندر وجود یک حرف ست
کہ دستِ ہیچ قوی بر ضعیف نگماری

پس از گرفتنِ عالم چو کوچ خواہد بود
رواست گر ہمہ عالم گرفتہ انگاری

بہ نیک و بد چو بباید گزشت آں بہتر
کہ نامِ نیک بدست آوری و بگزاری

ہزار سال نگویم بقاے عمر تو باد
کہ این مبالغہ دانم ز عقل نہ شماری

ہمیں سعادت و توفیق بر مزیدت باد
کہ حق گزاری و نا حق کسے نیازاری

اتابک سلجوق شاہ بن سلغر شاہ ، جو اتابکوں کے خاندان میں بڑا ظالم بادشاہ گزرا ہے اور جو آخر کو اپنے ظلم کے سبب قتل کیا گیا ، اس کی مدح میں چند شعر لکھ کر کہتا ہے :

مرادِ سعدی ز انشاد و زحمتِ خدمت
نصیحت ست بسمع قبولِ شاہنشاہ

دوامِ دولت و آرامِ مملکت خواہی
ثباتِ راحت و امنِ مزید و رفعتِ جاہ

کمر بطاعت و انصاف و عدل و عفو بہ بند
چو دستِ رحمتِ حق بر سرت نہادہ کلاہ

تو روشن آئنہای ز آہِ دردمند بہ ترس
عزیزِ من ! کہ اثر می کند در آئنہ آہ

معلمانِ بد آموز را سخن مشنو
کہ دیر سال بمانی بکام نیکی خواہ

ایل خاں[1] یعنی ہلاکو خاں یا اس کے بیٹے اباقا خاں کی شان میں ، جن کی ہیبت سے روم و روس و چین کے بادشاہ لرزتے تھے ، مدحیہ اشعار لکھ کر کہتا ہے :

ہر نوبتے نظر بہ یکے می کند سپہر
ہر مُدّتے زمیں بہ یکے می دہد اماں

بیخے نشاں کہ دولتِ باقیت بر دہد
کایں باغِ عمر گاہ بہار ست و گہ خزاں

---

۱ - ایل خاں کا اطلاق تاتار کے اکثر خوانین پر ہوتا ہے -

اے پادشاہ روے زمیں دور ازانِ تست
اندیشۂ تقلّبِ دوراں کن و زماں

چوں کامِ جاوداں متصوّر نمی شود
خرّم کسے کہ زندہ کند نام جاوداں

ناداں کہ بخل می کند و گنج مے نہد
مزدورِ دشمن ست تو بر دوستاں فشاں

یارب تو ہرچہ راے صواب ست و فعل خیر
اندر دل وے افگن و بر دست وے براں

آہوے طبع بندہ چنیں مشک می دہد
کز پارس می برند بتاتارش ارمغاں

سردار انکیانو ، جو خاندانِ اتابک کے زوال کے بعد سلطان اباقا خاں پسر ہلاکو خاں کے حکم سے فارس کا فرماں روا مقرر ہوا تھا اور اپنے قدیم تاتاری مذہب پر نہایت پختگی سے ثابت قدم تھا ، اُس کی شان میں جتنے قصیدے شیخ نے لکھے ہیں ان میں متعدد اشعار کے سوا باقی تمام نصیحت و پند مندرج ہے ۔ از آنجملہ ایک قصیدے میں بہت سے مواعظ و نصائح کے بعد لکھتا ہے :

حرامش باد ملک و پادشاہی
کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم

عروسِ زشت زیبا کے تواں کرد
وگر بر خود کند دیباے مُعلم

اگر مردم ہمیں بالا و ریش اند
بہ نیزہ نیزہ بر بستہ ست پرچم

چنیں پند از پدر نشنیده باشی
الا گر ہوشیاری بشنو از عمّ
چو یزدانت مکرّم کرد و مخصوص
چناں زی درمیانِ خلق عالم
کہ گر وقتے مکان پادشاہیت
نباشد ، ہم چناں باشی مکرّم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ
سخن ملکے ست سعدی را مسلّم
مقامات از دو بیروں ست فردا
بہشتِ جاودانی یا جہنم

سلجوق شاہ ، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ، اُس کی مدح کو ایک اَور قصیدے میں اس طرح ختم کیا ہے :

جہاں نماند و آثارِ مملکت ماند
بخیر کوش و صلاح و بعدل کوش و کرم
کہ ملک و دولتِ ضحّاک ، بے گنہ آزار
نماند و تا بہ قیامت برو بماند رقم
خطاے بندہ نگیری کہ مہتران و ملوک
شنیدہ اند نصیحت ز کہترانِ خدم
خنک کسے کہ پس از وے حدیثِ خیر کنند
کہ جز حدیث نمے ماند از بنی آدم

ان کے سوا جو قصیدے خواجہ شمس الدّین جوینی صاحبِ دیوان اور اس کے بھائی خواجہ علاء الدّین جوینی اور مجدالدّین

رومی اور فخرالدّین ابوبکر وغیرہم کی مدح میں لکھے ہیں اُن میں بھی اکثر مدح برائے نام ہے ، زیادہ تر نصیحت و پند ہے - اور بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو کسی کی مدح میں نہیں ہیں ، ان میں صرف نصائح و مواعظ یا فصلِ بہار کا سماں یا معشوق کی تعریف یا حمدِ الٰہی وغیرہ مندرج ہے -

ایک مختصر قصیدہ اول سے آخر تک بھی اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مدح اور نصیحت دونوں کا ڈھنگ معلوم ہو :

مدح و موعظۂ مجد الدین رومی

جہاں بر آب نہادہ ست و زندگی بر باد
غلامِ ہمّتِ آنم کہ دل برو ننہاد
جہاں نماند و خرّم روان آدمئے
کہ باز ماند ازو در جہاں بہ نیکی یاد
سرائے دولتِ باقی نعیمِ آخر تست
زمین سخت نگہ کن چو می نہی بنیاد
کدام عیش دریں بوستاں کہ بادِ اجل
ہمے بر آورد از بیخ قامتِ شمشاد
حیاتِ عاریتی خانہ ایست در رہِ سیل
چراغِ عمر نہادہ است بر دریچۂ باد
بسے بر آید و بے ما فرو شود خورشید
بہار گاہ خزاں باشد و گہے مرداد

بر آنچہ میگزرد دل منہ کہ دجلہ بسے
پس از خلیفہ بخواہد گزشت در بغداد

گرت ز دست بر آید چو نخل باش کریم
ورت بدست نباشد چو سرو باش آزاد

بسے بدیدۂ حسرت ز پس نگاہ کند
کسے کہ برگِ قیامت ز پیش نفرستاد

وجودِ خلق بدل می کنند ورنہ زمین
ہماں ولایتِ کیخسرو است و ملکِ قباد

چو طفل بر ہمہ بازید و بر ہمہ خندید
عجب تر آنکہ نگشتند دیگراں استاد

عروسِ ملک نکو روے دختریست ، ولے
وفا نمی کند ایں سست مہر با داماد

نہ خود سریرِ سلیماں بہ باد رفتے و بس
کہ ہر کجا کہ سریریست میرود برباد

ہمیں نصیحتِ من گوش دار و نیکی کن
کہ دانم از پسِ مرگم کنی بہ نیکی یاد

نداشت چشمِ بصیرت کہ گرد کرد و نخورد
ببرد گوے سعادت کہ صرف کرد و بداد

چنانکہ صاحبِ فرخندہ راے مجدالدّین
کہ بیخِ اجر نشاند و بناے خیر نہاد

نگویمت بہ تکلف فلانِ دولت و دین
سپہر مجد و معالی جہانِ دانش و داد

تو آں برادرِ صاحب دلی کہ مادرِ دہر
بہ سالہا چو تو فرزند نیک بخت نہ زاد

بہ روزگارِ تو ایّام دستِ فتنہ بہ بست
بہ یُمنِ تو درِ اقبال بر جہاں بکشاد

دلیل آں کہ ترا از خدائے نیک آید
بس ست خلق جہاں را کہ از تو نیک افتاد

یکے دعا کنمت بے رعونت از سرِ صدق
خدات در نفسِ آخریں بیامرزاد

تو ہم زیاں نہ کنی گر بصدقِ دل گوئی
کہ آفرینِ خدا بر روانِ سعدی باد

ایک ترجیع بند کے کچھ اشعار بھی جو کہ شیخ نے سعد[1]

---

۱ - امیر فخر الدین ابوبکر ، اتابک ابوبکر کے امرائے نامدار میں سے تھا جو ادنیٰ درجے سے منصبِ امارت بلکہ مشارکتِ ملک تک پہنچا تھا اور سعد بوبکر اتابک کا بیٹا تھا - جس زمانے میں ہلاکو خاں نے بغداد کو فتح کیا تھا ، ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد بوبکر کو اظہارِ دوستی و خیر خواہی کے لیے بغداد میں بھیجا تھا - جب وہاں سے باعزازِ تمام رخصت ہوا تو راہ میں باپ کے مرنے کی خبر سنی ، جس سے اور ولی عہدوں کی طرح اس کو خوش ہونا چاہیے تھا ، مگر اس کو اس خبر سے ایسا صدمہ ہوا کہ راہ ہی میں سخت بیمار ہو گیا اور رستے ہی میں باپ کی وفات سے بارہ روز بعد مر گیا - اس کی سناؤنی جب شیراز میں آئی ہے تو شیخ نے یہ مرثیہ لکھا ہے - جیسا کہ ترجیع بند کے شعر سے ظاہر ہے ، سعد کے بعد اس کا بیٹا اتابک محمد مظفر اس کا جانشین ہوا -

بن بوبکر کے مرثیے میں لکھے ہیں اور جو کلیّات میں غلطی سے امیر فخر الدّین ابوبکر کے نام پر لکھ دیا گیا ہے ، بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

غریباں را دل از بہرِ تو خون ست
دلِ خویشاں نمی دانم کہ چون ست

عنانِ گریہ چون شاید گرفتن
کہ از دستِ شکیبائی برون ست

مگر شاہنشہ اندر قلبِ لشکر
نمی آید کہ رایت سرنگون ست

شکیبائی مجو از جانِ مہجور
کہ بار از طاقتِ مسکیں فزون ست

سکون در آتشِ سوزندہ گفتم
نشاید کرد ، و درماں ہم سکون ست

کہ دنیا صاحبے بد عہد و خونخوار
زمانہ مادرے بے مہر و دون ست

نہ اکنون ست بر ما جورِ ایّام
کہ از دورانِ آدم تا کنون ست

نمے دانم حدیثِ نامہ چون ست
ہمے بینم کہ عنوانش بخون ست

بزرگاں چشم و دل در انتظارند
عزیزاں وقت و ساعت می شمارند

غلاماں دُرّ و گوہر مے فشانند
کنیزاں دست و ساعد مے نگارند

ملک خان و مثاق و بدر و ترخان
بہ رہوارانِ تازی بر سوارند

کہ شاہنشاہِ عادل سعد بوبکر
بہ ایوانِ شہنشاہی در آرند

حرم شادی کناں بر طاق و ایواں
کہ مروارید بر تاجش ببارند

زمیں مے گفت عیشے خوش گزاریم
ازاں پس آسماں گفت ار گزارند

امیدِ تاج و تختِ خسروی بود
ازیں غافل کہ تابوتش در آرند

چہ شد پاکیزہ رویانِ حرم را
کہ بر سر کاہ و بر زیور غبارند

نشاید پارہ کردن زیور و روے
کہ مردم تحتِ امرِ کردگارند

و لیکن با چنیں داغِ جگر سوز
نمے شاید کہ فریادے ندارند

بلے شاید کہ مہجوراں بگریند
روا باشد کہ مظلوماں بزارند

نمے دانم حدیثِ نامہ چون ست
ہمے بینم کہ عنوانش بخون ست

پس از مرگِ جواناں گل مماناد
پس از گل در چمن بلبل مخواناد
کس اندر زندگانی قیمتِ دوست
نداند ، کس چنیں قیمت مداناد
سر آمد روزگارِ سعدِ بوبکر
خداوندش بہ رحمت در رساناد
بہ تلخی رفت از دنیاے شیریں
زلالِ کام در حلقش چکاناد
جزاے مردہ رفتن در غریبی
شراب از دستِ پیغمبر ستاناد
دریں گیتی مُظفّر شاہ عادل
محمّد نام برادرش بماناد
سعادت پرتوِ نیکاں دہادش
بخوئے صالحانش پروراناد
روانِ سعد را با جانِ بوبکر
بہ اوجِ روح و راحت گستراناد
بکامِ دوستان و بختِ فیروز
بسے دورانِ دیگر بگزراناد
نمے دانم حدیثِ نامہ چون ست
ہمے بینم کہ عنوانش بخون ست

صاحبیہ

یہ مجموعہ شیخ کے متفرّق اشعار کا سو صفحے کے قریب ہے جس میں قطعہ ، رباعی ، فرد ، ملمّع ، مثنوی وغیرہ جمع کی گئی ہیں ۔ چونکہ شیخ کے ساتھ خواجہ شمس الدّین حسین صاحبِ دیوان کو کمال خلوص اور عقیدت تھی اس لیے شیخ نے اس مجموعے کا نام صاحبیّہ رکھا ہے ۔

ان اشعار میں کوئی نئی خصوصیّت ایسی نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے ۔ بیشتر اشعار نصیحت و پند پر اور کسی قدر حسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ہیں ۔ چند قطعے اور رباعیاں ، جو سرسری نظر میں اچھی معلوم ہوئیں ، نقل کی جاتی ہیں :

قطعات

تفرّسِ ناکساں

ناکساں را فراستے ست عظیم
گرچہ تاریک طبع و بد خویند

چوں دو کس مشورت کنند بہم
گوید ایں عیب من ہمی گویند

خصائلِ سگاں

سگے شکایتِ ایّام با یکے مے گفت
نہ بینیم کہ چہ برگشتہ حال و مسکینم

نہ آشیانہ چو مرغاں نہ غلّہ چوں موراں
قناعتم صفت و بُردباری آئینم

گرم دہند خورم ورنہ میروم آزاد
نہ ہمچو آدمیاں خشم ناک بنشینم

مرا نہ برگِ زمستاں نہ عیشِ تابستاں
کفایت ست ہمیں پوستین پارینم

ہزار سنگ بریں جانِ بیگنہ بخورم
کہ اوفتادہ نہ بینی بر ابرواں چینم

نہ در ریاضت و خلوت مقام مے سازم
کہ جائگاہ کلوخ ست و سنگ بالینم

بہ لقمۂ کہ تناول کنم ز دست کسے
رواست گر بزند بعد ازاں بہ ژوپینم

چو گربہ در نہ ربایم ز دستِ مردم چیز
ور اوفتادہ بود ریزہ ریزہ بر چینم

بجائے من کہ نشیند کہ در مقامِ رضا
برابر ست گلستان و تلِّ سرگینم

مرا کہ سیرت ازیں جنس و خو بدیں صفت ست
چہ کردہ ام کہ سزاوارِ سنگ و نفرینم

جواب داد کزیں بیش نعتِ خویش مگو
کہ خیرہ گشت ز وصفت زبانِ تحسینم

ہمیں دو خصلتِ ملعون کفایتت کہ ترا
غریب دشمن و مُردار خوار مے بینم

ضرورتِ ملاعبت بعد از مشقّت

نظر کردم بچشمِ راے و تدبیر
ندیدم بہ ز خاموشی خصالے
نگویم لب بہ بند و دیدہ بر دوز
و لیکن ہر مقامے را مقالے
زمانے بحثِ علم و درس و تنزیل
کہ باشد نفسِ انساں را کمالے
زمانے شعر و شطرنج و حکایات
کہ خاطر را بود دفع ملالے
خدایست آں کہ ذاتِ بے مثالش
نگردد ہرگز از حالے بحالے

ہمدردیِ بنی نوع

رَحِمَ اللہ مَعشَرَ الماضِیِن
کہ بہ مردی قدم سپردندے
راحتِ نفسِ بندگانِ خداے
راحتِ جانِ خود شمردندے
آں عزیزاں چو زندہ می نشوند
کاش ایں ناکساں بمردندے

انجامِ ظالماں

بس دستِ دعا بر آسماں بود
تا پاے بر آمدت بہ سنگے
اے گرگ نہ گفتمت کہ روزے
ناگہ بہ سر افتدت پلنگے

حقوقِ پدراں

اے طفل کہ دفع مگس از خود نتوانی
ہرچند کہ بالغ شدی آخر نہ ہمانی
شکرانۂ زور آوریِ روزِ جوانی
آنست کہ قدرِ پدرِ پیر بہ دانی

شانِ رزاقی

صانعِ نقشبندِ بے مانند
کہ ہمہ نقشِ او نیکو آید
رزقِ طائر نہاد در پر و بال
کہ بہر طعمۂ فرو آید
روزیٔ عنکبوت را بہ مگس
پر دہد تا بہ نزدِ او آید

ولیِ خائن بہ یتیماں

الحق آمناے مال ایتام
ہمچوں تو حلال زادہ یابند

هرگز زن وَ مردِ کفر و اسلام
نفس از تو پلید تر نه زایند
طفلانِ ترا پدر بمیراد
تا جورِ وصی بیاز مایند
اطفالِ عزیزِ ناز پرورد
از دستِ تو دست بر خدایند

ظالم محتاط در حقِ خود

امیر ما عسل از دستِ خلق می نخورد
که زہر در قدح انگبیں تواند بود
عجب که در عسل از زہر میکند پرہیز
حذر نمی‌کند از تیرِ آہِ زہر آلود

ترحّم بر بیوگان

شنیدم که بیوه زنے درد مند
ہمی‌گفت و رخ بر زمیں مے نہاد
ہر آں کد خدارا که بر بیوه زن
ترحّم نباشد زنش بیوه باد

منعِ دشنام

ہر بد که بخود نمے پسندی
باکس مکنِ اے برادرِ من*

گر مادرِ خویش دوست داری
دشنام مده به مادرِ من

مدافعتِ دشمن

مقابلت نکند با حجر به پیشانی
مگر کسے که تهوّر کند بنادانی
کس این خطا نه پسندد که دفعِ دشمنِ خود
توانی و نکنی یا کنی و نتوانی

مطائبه

شنیده‌ام که فقیہے به دشتبانے گفت
که ہیچ خربزه داری رسیده گفت آرے
ازیں طرف دو به دانگے ، گر اختیار کنی
و زآں چہار به دانگے قیاس کن بارے
سوال کرد که چندیں تفاوت ازپے چیست
که فرق نیست میانِ دو نوع بسیارے
بگفت ازانچه تو بینی حلال و مِلکِ من ست
نیامده ست بدستم بوجہِ آزارے
و زاں دگر پسرانم بغارت آوردند
حرام را نبود نزدِ شرع مقدارے
فقیه گفت ، حکایت دراز خواہی کرد
ازیں حرامترت ہست صد به دینارے

امتحانِ دوستی

تا سگاں را وجوہ پیدا نیست
مشفق و مہربانِ یک دگرند
لقمۂ درمیانِ شاں انداز
کہ تہی گاہِ یک دگر بدرند

رباعیات

پاسِ عہد

شب نیست کہ چشمم آرزومند تو نیست
ویں جاں بہ لب رسیدہ در بند تو نیست
گر تو دگرے بجاے من بگزینی
من عہد تو تشکنم کہ مانند تو نیست

تاسف بر عمرِ گزشتہ

ماہیِ امید عمرم از شست برفت
بے فائدہ روزم چو شب مست برفت
عمرے کہ ازو دمے بجانے ارزد
افسوس کہ رائگانم از دست برفت

انجامِ ظالم

ازبس کہ بیازرد دلِ دشمن و دوست
گوئی بگناہ مسخ کردندش پوست

وقتے غمِ او بر ہمہ دلہا بودے
اکنوں ہمہ غمہائے جہاں بر دلِ اوست

فضلِ دوست بر ہمہ خیر

گویند ہوائے فصل آذار خوش ست
بوئے گل و بانگ مرغِ گلزار خوش ست
ابریشمِ زیر و نالۂ زار خوش ست
اے بے خبراں ایں ہمہ با یار خوش ست

مجبوریِ عاشق

گویند مرو درپے آں سروِ بلند
انگشت نمائے خلق بودن تاچند
بے فائدہ پندم مدہ اے دانشمند
من چوں نروم کہ مے برندم بہ کمند

خوفِ مرگ

آہو برہ را کہ شیر در پے باشد
بے چارہ چہ اعتماد بر وے باشد
ایں ملح در آب چند بتواند بود
ویں برف در آفتاب تا کے باشد

توحید

آں را کہ نظر بروئے ہر کس باشد
در دیدۂ صاحب نظراں خس باشد

قاضی بہ دو شاہد بدہد فتوی ِ شرع
در مذہبِ عشق شاہدے بس باشد

ریاضت کشاں

مرداں ہمہ عمر پارہ بر دوختہ اند
قوتے بہزار حیلہ اندوختہ اند
فردائے قیامت بگناہ ایشاں را
باشد کہ نسوزند کہ خود سوختہ اند

مطائبہ

با دوست بگرما بہ درم خلوت بود
و آں روے گُلینش گلِ حمام آلود
گفتا دگرایں روے کسے دارد دوست؟
گفتم بگلِ آفتاب نتواں اندود

غرورِ حسن

چوں صورتِ خویشتن در آئینہ بدید
و آں کام و دہان و لب و دنداں بگزید
مے گفت چناں کہ میتوانست شنید
بس جاں بلب آمد کہ بدیں لب نہ رسید

انتظار

امشب نہ بیاضِ روز بر می آید
نہ نالۂ مرغانِ سحر می آید

بیدار نشستہ ام نظر بر سرِ کوہ
تا صبح کہ از سنگ بدر می آید

فصلِ خزاں

وقتست کہ چشمِ فتنہ خوابش ببرد
باد از رُخِ گل حُسن شبابش ببرد
گل وقت رسیدن آبِ عطّار ببرد
عطّار بوقتِ رفتن آبش ببرد

فصلِ بہار

وقتِ گل و روزِ شادمانی آمد
ہنگامِ نشاط و کامرانی آمد
آں شد کہ بہ سرما نتوانی آمد
سرما شد و وقتِ مہربانی آمد

عظمتِ عاشق و معشوق

ما چاکرِ آنیم کہ دل برباید
یا دل بہ کسے دہد کہ جاں آساید
آنکس کہ نہ عاشق و نہ معشوق کسست
در مُلکِ خدا اگر نباشد، شاید

بے ثباتیِ زندگانی

آں گل کہ ہنوز نو بدشت آمدہ بود
نشگفتہ تمام، بادِ مہرش بربود

بیچاره بسے آمید در خاطر داشت
آمید دراز و عمر کوتاه ، چه سود!

حسرت

من دوش قضا یار و قدر پشتم بود
نارنج زنخدانِ تو در مُشتم بود
دیدم که همے گزم لب شیرینت
بیدار چو گشتم سر انگشتم بود

صلح با دشمن قوی

چون خیلِ تو صد باشد و خصمِ تو هزار
خود را بهلاک می سپاری زنهار
تا بتوانی بر آور از خصم دمار
چون جنگ ندانی آشتی عیب مدار

ناگزیر بودن معشوق

نا مردم اگر زنم سر از مهر تو باز
خواهی بکشم بجور و خواهی بنواز
ور بگریزم ز دستت اے مایهٔ ناز
هر جا که روم پیش تو مے آیم باز

صدقِ طلب

تا سر نکنم در سرت اے مایهٔ ناز
کوته نکنم ز دامنت دستِ نیاز

ہرچند کہ راہم بتو دور است و دراز
در راہ بمیرم و نگردم ز تو باز

خوبرویاں را دوست داشتن

گر بے خبران و عیب گویاں از بس
منسوب کنندم بہ ہوا و بہ ہوس
آخر نہ گناہ ست کہ من کردم و بس
منظور ملیح دوست دارد ہمہ کس

حفظِ جان از مہالک

چوں زہرۂ شیراں ببرد نعرۂ کوس
بر باد مدہ جانِ گرامی بفسوس
با آنکہ خصومت نتواں کرد ، بساز
دستے کہ بقوّت نتواں برد ، ببوس

معاملت با دوست

یا ہمچو ہمائے بر من افگن پرِ خویش
تا بندگیت کنم بجان و سر خویش
ور لائقِ خدمتم ندانی برِ خویش
گو من سرِ خویش گیرم و کشورِ خویش

ہمسائگیٔ نیکاں و بداں

ہمسایہ کہ میلِ طبع باشد سُویش
فردوسِ بریں بود سرا در کویش

وانرا که نخواهی که به بینی رویش
دوزخ باشد بهشت در پهلویش

حسرتِ جوانی در پیری

هر سرو قدے که بگزرد در نظرم
در هیأتِ او خیره بماند بصرم
چون من نتوانم که جوان گردم باز
آخر کم از آنکه در جوانان نگرم

سختیِ صدمهٔ فراق

خود را بمقامِ شیر می دانستم
چون خصم آمد به روبہے مانستم
گفتم ، من و صبر ، اگر بود روزِ فراق
چون واقعه اوفتاد نتوانستم

تاسّف بر عمرِ گزشته

شب‌ہا ز ہمہ خلق نہاں می گریم
چشم از غم دل بر آسماں می گریم
طفل از غمِ مرغِ رفته چون گریه کند
بر عمرِ گزشته ہم چناں می گریم

امتناع از خورد گیری

چون ما و شما اقارب یک دگریم
به زاں نبود که پردهٔ ہم ندریم

اے خواجہ تو عیب من مکن تا من نیز
عیب تو نگویم کہ یک از یک بتریم

خواہشِ جنگ بامیدِ معانقۂ صلح

گر بر رگِ جاں زشتت آید تیرم
چہ خوشتر ازانکہ پیش دستت میرم
دل با تو خصومت آرزو می کندم
تا صلح کنی و در کنارت گیرم

حضورِ دوست در ہمہ حال

مے آئی و لطف و کرمت مے بینم
و آسائشِ جاں در قدمت مے بینم
و آں وقت کہ غائبی ہمت مے بینم
ہر جا کہ نگہ مے کنمت مے بینم

تحاشی از توبہ

گفتم کہ دگر چشم بہ دلبر نہ کنم
صوفی شوم و گوش بہ منکر نہ کنم
دیدم کہ خلافِ طبع موزون من ست
توبت کردم کہ توبہ دیگر نہ کنم

دشواریٔ مواصلت

مہ را ز فلک بطرفِ بام آوردن
وز روم کلیسیا بشام آوردن

در وقتِ سحر نمازِ شام آوردن
بتوان ، نتوان ترا بدام آوردن

دلیلِ عدمِ وصول الی الله

نہ سرو توان گفت نہ خورشید و نہ ماہ
آہ از تو کہ در وصف نمے آئی آہ
ہر کس بہ رہے میرود اندر طلبت
گر رہ بتو بودے نہ بُدے این ہمہ راہ

سیرِ نہ شدن از دوست

اے راہروان را گزر از کوے تو نہ
ما بے خبر از عشق وگزر سوے تو نہ
ہر تشنہ کہ از دست تو بستاند آب
از دستِ تو سیر گردد از روے تو نہ

فراموش نکردن در غیبت

اے یار کجائی کہ در آغوش نہ ای
و امشب بر ما نشستہ چون دوش نہ ای
اے سروِ بلند و راحتِ جسم و روان
ہرچند کہ غائبی فراموش نہ ای

شکایت از دیدہ و دل

اے کاج نہ کردمے نگاہ از دیدہ
بر دل نہ زدے عشق تو راہ از دیدہ

تقصیر ز دل بود و گناه از دیده
آه از دل و صد ہزار آه از دیده

طلبِ عنایت از دوست

روزے دو سہ شد کہ بنده ننواختۂ
و اندیشہ بذکر ما نہ پرداختۂ
زاں مے ترسم کہ دشمناں اندیشند
کز چشمِ عنایتم بینداختۂ

دشواریٔ ترکِ نظر

گفتم کہ کنم توبہ ز صاحب نظری
باشد کہ بلاے عشق گردد سپری
چنداں کہ نگہ مے کنم اے رشکِ پری
بارِ دومیں ز اولیں خوب تری

در بلاے عظیم از اندک ضرر ترسیدن

گویند کہ دوش شحنگاں تتری
دزدے بگرفتند بصد حیلہ گری
امروز بہ آویختنش مے بردند
می گفت رہا کن کہ گریباں بدری

عشقِ فطری

گیرم کہ بہ فتواے خردمندی و راے
از دائرۂ شرع بروں ننہم پاے

با میل که طبع می کند چه توان کرد
عیبے ست که در من آفریده ست خدائے

مفردات

فرزندانِ ناخلف

دانی چه گفته اند بنی عوف دز عرب
نسلِ بُریده به که موالید بے ادب

ترکِ ماسوا

تو آتش به نےَ در زن و درگزر
که نه خشک در بیشه ماند نه تر

زور آزمائی بر ضعفا

مروت نباشد بر افتاده زور
بُرد مرغ دوں دانه از پیشِ مور

موافقتِ روزگار

خواہی که به طبعت ہمه کس دارد دوست
با ہر که در اوقتی چناں باش که اوست

معنیِ ہدایت و ضلالت

گر راه نمائی ہمه عالم راه ست
ور دستنگیری ہمه عالم چاه ست

حوادثِ ناگہانی

نہالے کہ سی سال گردد درخت
ز بیخش بر آرد یکے بادِ سخت

صحبتِ ناجنس

اگر نواب و سرہنگاں ہم از درگہ برانندت
ازاں بہتر کہ در پہلوے مجہولے نشانندت

موافقتِ وقت

سلطاں چو بمنزلِ گدایاں آید
گر بر سرِ بوریا نشیند شاید

شانِ ضعفا

گر ز ہفت آسماں گزند آید
ہمہ بر عضوِ دردمند آید

فرق در مشقّت و مصیبت

اگر دنداں نباشد ناں تواں خورد
مصیبت آں بود کت ناں نباشد

خاصۂ گدایاں

منعم کہ نظر بحالِ درویش کند
چنداں کہ کرم کند طمع بیش کند

اعتدال در تواضع

تواضع گرچه محمود ست و فضل بیکران دارد
نشاید کرد بیش از حد که هیبت را زیان دارد

دوگونه یاس بعد از امید

گفتم که بر آید آبے از چاهِ امید
افسوس که دلو نیز در چاه افتاد

مسافر نوازی

بشکر آنکه تو در خانهٔ و اہلت پیش
نظر دریغ مدار از مسافرِ درویش

فرق در عاقل و نادان

کوته نظران را نبود جز غمِ خویش
صاحب نظران را غمِ بیگانه و خویش

تحمّل

گر بلندت کسے دہد دشنام
به که ساکن دہی جوابِ سلام

ناصحِ تجربه کار

بشنو که من نصیحتِ پیران شنوده ام
بیش از تو خلق دیدهٔ و پیش از تو بوده ام

دل داری برائے دل آزاری

از بہر دل کسے بدست آوردن
مطبوع نباشد دگرے آزردن

جزائے بد

چو بد گفتی مباش ایمن ز بد گو
کہ بد را کس نخواہد گفت نیکو

عالمِ مفلس

صاحب دل و نیک سیرت و علّامہ
گو کفش دریدہ باش و خلقان جامہ

اعتدال در سخا

کرم بجائے فروماندگاں چو بتوانی
مروتست نہ چندانکہ خود فرومانی

تفسیرِ مردانگی

مردی نہ بقوّت ست و شمشیر زنی
آنست کہ ظلمے کہ توانی نہ کنی

استحکامِ دوستی

تو با ما روز و شب در باغ آنسی
خلافست اینکہ طول العہد یُنسي

ہدیۂ ضعفاء

پاے ملخے نزدِ سلیماں بردن
عیبست و لیکن ہنرست از مورے

نصیحت ناشنودن

من سخن راست نوشتم تو اگر راست نخوانی
جرم لجلاج نباشد چو تو شطرنج ندانی

ختمِ کلام

کتبت لیبقی الذّکر فی امم بعدی
فیاذا الجلال اغفر لکاتبہ السّعدی

مطائبات و ہزلیات و مضحکات

شیخ کے کلّیات کا سب سے اخیر حصّہ مجموعۂ ہزلیات ہے جو تیس بتیس صفحے سے زیادہ نہ ہوگا - یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارضِ کمال پر ایک نہایت بدنما مسّہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے - اس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے - حضرت نے اس حصّے میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزادی اور بے باکی سے دل کھول کر فحش و ہزل کی داد دی ہے ، جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ پوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اسی شخص کا ہے جس کے نتائجِ افکار سے گلستاں اور بوستاں جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں - آدمی کا خطاوار اور ناقص ہونا یہی اس کے انسان ہونے کی علامت ہے اور اس کے اقوال و افعال کا تفاوت اور اختلاف اور ان کا ہمیشہ ایک ضابطے اور قانون کے موافق سرزد نہ ہونا ، یہی وہ چیز ہے جو اس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے - انسان کے خیالات کو ایک نادان بچے کی حرکتوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ، جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری حرکت پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے - اس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا اور جب یہ صفت حد سے گزر جاتی ہے تو اس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے ، مگر شیخ نے اس مجموعے کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت میں

لکھی ہیں جو قابلِ لحاظ ہیں - وہ لکھتا ہے کہ :

الزمنی بعض ابناء الملوک ان أصنف لہ کتاباً فی الہزل علیٰ طریق السوزنی فلم أجبہ فہددنی بالقتل فلاجل ذالک اجبت امرہ و انشدت ھذہ الابیات و انا استغفر اللہ العظیم

یعنی : ایک بادشاہزادے نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ میں اس کے لیے ایک کتاب حکیم سوزنی کی روش پر ہزل میں لکھوں - میں نے نہ مانا ، اس پر اس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی ، اس لیے ماننا پڑا اور یہ اشعار لکھے ، اور میں خدائے بزرگ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں -

شیخ کا یہ عذر جہاں تک کہ ہماری رائے ناقص میں آتا ہے بہت قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے - شیخ ، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ، ہمیشہ سیر و سفر میں رہتا تھا - تاتار سے لے کر روم و مصر و حبش تک اس کی جولاں گاہ تھی - اس کی شاعری اور نکتہ سنجی کا شہرہ اس کی زندگی ہی میں دور دور پہنچ گیا تھا - مسلمان امیر زادوں اور بادشاہزادوں کی صحبتوں میں لہو و لعب اور تمسخر و استہزا کی بنیاد پڑ چکی تھی - پس اگر کسی نالائق بادشاہزادے نے شیخ کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا شہرہ سن کر ، اس خیال سے کہ ہمیشہ گرمیِ صحبت کے لیے ایک مجموعۂ ہزل و فحش موجود رہے ، شیخ کو ان ہفوات کے لکھنے پر مجبور کیا ہو تو کچھ تعجّب کی بات نہیں ہے ، اور چونکہ اس مجموعے میں صریح فحش اور علانیہ پھکّڑ کے سوا بامزہ اور لطیف خیالات ، جیسے کہ شیخ کے کلام کی عام خاصّیت ہے ، بہت کم پائے جاتے ہیں ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تمام ہزلیات دل کی اُپج اور طبیعت کی امنگ سے نہیں بلکہ محض نفرت و کراہت کے ساتھ لکھی گئی ہیں -

ایران میں ہزل و فحش کی شاعری دورۂ غزنویہ کے شعراء سے برابر چلی آتی تھی اور یہ طریقہ اس قدر عام اور بے عیب ہو گیا تھا کہ افاضل شعرا کی عظمت اور بزرگی میں اس سے کچھ فرق نہ آتا تھا ۔ اکثر ہاجی اور ہزّال حکیم کے لقب سے ملقّب ہوتے تھے اور اب تک ہوتے ہیں ، جیسے حکیم انوری ، حکیم خاقانی ، حکیم شفائی ، حکیم قاآنی وغیرہ وغیرہ ۔ سوزنی بھی ، جو چھٹی صدی کا شاعر ہے اور جس کا ذکر شیخ کی مذکورہ بالا عبارت میں ہے ، حکیم سوزنی کہلاتا تھا ۔ اُس کا ہزل اور فحش انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا ۔ اُس نے حکیم سنائی کی بہت سی ہجویں لکھی ہیں اور حکیم صاحب نے بھی با ایں ہمہ مشیخت و تقدّس اس سے تنگ آ کر اس کے جواب میں ایک ایسی جامع و مانع گالی تصنیف فرمائی ہے جو سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھکّڑ کا جواب ہو سکتی ہے ۔ حکیم ابوالعلائی گنجوی ، جو مُنوچہر شروان شاہ کے عہد میں پائے تخت کا ملک الشعراء تھا ، باوجودیکہ وہ حکیم خاقانی کا مربی اور خسر تھا ، اس کے اور خاقانی کے باہم ایسی رکیک اور نالائق ہجوبازی ہوتی تھی جس کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو برائی سوسائٹی میں اس قدر عام اور بے عیب ہو جائے ، اس سے بالکل پاک اور مبرّا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جا سکتا جس کا کہ وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے ۔

ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے عنفوانِ شباب میں ، جو کہ شوخی اور بیباکی کا زمانہ ہے ، کسی موقع پر یہ خرافات بھی لکھ دی ہوگی ، اور ایسا کم و بیش ہر شخص سے ظہور میں آتا ہے ۔ مگر کوئی شخص ایسے بیہودہ اور لغو کلام کو اپنی تصنیفات میں شامل کر کے اپنی طرف منسوب اور اپنے نام سے شائع کرنا نہیں

چاہتا ۔ شیخ نے بھی یقیناً ایسا ہرگز نہ چاہا ہوگا مگر چونکہ وہ زمرۂ مشائخ و عرفا میں سے گنا جاتا تھا اور معتقدین کے نزدیک اس کا ہزل بھی انوار و برکات سے خالی نہ تھا اس لیے کسی بزرگوار نے اس کی وفات کے بعد اس ناشدنی مجموعے کو بھی تبرکاً و تیمناً کلیات میں داخل کر دیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ گلستان کے مرتب ہونے سے پہلے لکھا جا چکا تھا کیونکہ اس کے چند اشعار، جن میں زیادہ ہزل نہیں ہے ، شیخ نے گلستان میں اپنے اپنے موقع پر نقل کیے ہیں ۔

ہم کو بہت تجسس سے چند رباعیاں اور قطعے اس مجموعے میں ایسے ملے ہیں جو فحش سے پاک ہیں ، سو وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

رباعیات

انجامِ حسنِ نوخطاں

آں عہد بیاد داری و دولت و داد
کز عاشقِ بیچارہ نمی کردی یاد
آنگہ بگریختی کہ کس چوں تو نہ بود
و امروز بیامدی کہ کس چوں تو مباد

ایضاً

آں ماہ کہ گفتی ملکِ رحمان ست
ایں بار اگرش نگہ کنی شیطان ست
روے کہ چو آتش بہ زمستاں خوش بود
امروز چو پوستیں بہ تابستان ست

تقویٰ بضرورت

چو خویشتن نتواند کہ مے خورد قاضی
ضرورتست کہ بر دیگراں بگیرد سخت
کہ گفت پیرہ زن از میوہ می کند پرہیز
دروغ گفت کہ دستش نمے رسد بہ درخت

تأسف در بلائے عظیم بر فوتِ اندک

مردکے غرقہ بود در جیحوں
کز سمرقند بود پندارم
بانگ مے کرد و زار می نالید
کائے دریغا کلاہ و دستارم

توبۂ ضعفِ پیری

حریفِ عمر بسر بردہ در فسق و فجور
بوقتِ مرگ پشیماں ہمی خورد سوگند
کہ توبہ کردم و دیگر گنہ نخواہم کرد
تو خود دگر نتوانی بریش خویش مخند

عربی قصائد اور مقطّعات

کلیّات شیخ میں بیس صفحے کے قریب قصیدے اور قطعے بھی شامل ہیں اور ان کے سوا اس کے ملمّعات میں عربی اشعار اور مصرعے کثرت سے موجود ہیں ۔ گلستان میں بھی ، جیسا کہ اس نے خاتمے میں تصریح کی ہے ، تقریباً تمام عربی اشعار اسی کے ہیں ۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ دیار عرب میں بسر ہوا تھا اور عربی زبان بمنزلۂ مادری زبان کے ہوگئی تھی ، اس کے تمام فارسی اور عربی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد اس نے زیادہ تر اپنی توجّہ دینیات اور تصوّف اور علم ادب میں مصروف کی تھی ۔ گو اس کا عربی کلام بہت تھوڑا ہے ، مگر جس قدر ہے ، وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مشّاق اور ماہر ادیب کا ہونا چاہیے۔ با ایں ہمہ وہ عربی شعر میں شاعری کا ادعا نہیں کرتا ۔ چنانچہ بغداد کے مرثیے میں لکھتا ہے :

و بالشعراء ایم الله لست بمدع
و لو کان عندی ما ببابل من سحر

بخدا کہ میں شاعری کا دعویٰ نہیں کرتا ، اگرچہ میرے کلام میں وہ جادو موجود ہے جو بابل میں تھا ۔

هنالک نقادون علما و خبرة
و منتخبو القول الجمیل من الهجر

یہاں علم اور واقفیت کی رو سے پرکھنے والے اور عمدہ کلام کو برے کلام میں سے چھانٹنے والے موجود ہیں ۔

جرت عبراتی فوق خدی کابة
فانشأت هذا فی قضیة ما یجری

سوزِ دل کے سبب میرے آنسو چہرے پر ٹپک پڑے ، سو میں نے یہ قصیدہ اس سرگزشت کے بیان میں لکھ لیا ۔

و لو سبقتنی سادة جل قدرهم
لها حسنت منی مجاوزة القدر

اگر ذی رتبہ لوگ اس مضمون میں مجھ سے سبقت کرتے ، تو البتہ مجھ کو اپنے رتبے سے تجاوز کرنا زیبا نہ تھا ۔

بہرحال اس کا عربی کلام جس قدر ہے اور جیسا ہے غنیمت ہے ، اور اس سے شیخ کی شاعری کا رتبہ سوایا بلکہ ڈیوڑھا ہوگیا ہے ۔ اب ہم اس کے ایک طولانی قصیدے میں سے ، جو کہ اس نے خرابیِ بغداد پر لکھا ہے ، کچھ اشعار بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں :

حبست بجفنی المدامع لا تجری
فلما طغی الماء استطال علی السکر

میں نے اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روکا تھا کہ بہنے نہ پائیں ، پر جب پانی نے طغیانی کی تو اس بند کو توڑ ڈالا ۔

نسیم صبا بغداد بعد خرابها
تمنیت لو کانت تمر علی قبری

کاش ! ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد اس کی ہوا کا جھونکا میری قبر پر گزرتا ۔

لان ھلاک النفس عند اولی النھیٰ
احب لھم من عیش منقبض الصدر

کیوں کہ عقل مندوں کے نزدیک مر جانا تنگ دل جینے سے بہتر ہے ۔

زجرت طبیباً جس نبضی مداویاً
الیک فما شکوای من مرض یبری

میں نے طبیب کو جب کہ اس نے علاج کے لیے میری نبض کو چھؤا ، جھڑک دیا کہ جا اپنا کام کر ، مجھ کو ایسے مرض کی شکایت نہیں جو اچھا ہو سکے ۔

لزمت اصطبارا حیث کنت مفارقاً
و ھذا فراق لا یعالج بالصبر

میں نے ہمیشہ احباب کی جدائی میں صبر اختیار کیا ہے ، مگر یہ ایسی جدائی ہے جس کا علاج صبر سے ممکن نہیں ۔

و لا تسألن عما جری یوم حصرھم
و ذالک مما لیس یدخل فی الحصر

نہ پوچھو جو حال بنی عباس کی قید کے دن گزرا ۔ یہ وہ حال ہے جو قیدِ بیان میں نہیں آ سکتا ۔

آدیرت کؤوس الموت حتی کانہ
رؤوس الاساری تحرکن من السکر

شرابِ مرگ کے جام گردش میں لائے گئے، یہاں تک کہ قیدی کُشتوں کے سر (تڑپتے ہوئے) ایسے معلوم ہوتے تھے گویا نشے میں جنبش کر رہے ہیں -

بکت جدر المستنصریة ندبة
علی العلماء الراسخین ذوی الحجر

علمائے راسخین پر، جو کہ اصحابِ عقل و دانش تھے، مدرسۂ مستنصریہ کی دیواریں زار زار رو رہی ہیں -

محابر تبکی بعدھم بسوادھا
و بعض قلوب الناس احلک من حبر

ان کے بعد دواتیں اپنی سیاہی کے آنسوؤں سے روتی ہیں، مگر بعض لوگوں کے دل دوات سے زیادہ سیاہ ہیں -

نوائب دہر لیتنی مت قبلھا
و لم ار عدوان السفیہ علی الحبر

یہ زمانے کے سخت حادثے ہیں - کاش میں ان سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم دانش‌مندوں پر نہ دیکھتا -

وقفت بعبادان ارقب دجلة
کمثل دم قان تسیل الی البحر

میں نے شہر عبادان میں ٹھہر کر دجلے کے پانی کو دیکھا کہ نکتر خون کی مانند سمندر کی طرف بہتا تھا -

و فائض دمعی فی مصیبة واسط
یزید علیٰ مدّالبحیرة و الجزر

میرے آنسو، جو شہر واسط کی مصیبت میں جاری ہیں، خلیج فارس کے مدّ و جزر کو اور بڑھا دیتے ہیں۔

و هب ان دارالملک ترجع عامرا
و یغسل وجهالعارفین عن العفر

یہ نہ سمجھو کہ اب دارالخلافہ پھر آباد ہوگا اور علماء کے چہرے غبارِ ذلت سے پاک کیے جائیں گے۔

فاین بنوالعباس مفتخر الوریٰ
ذووا الخلق المرضی والغرر الزہر

کہاں ہیں بنی عباس جن سے عالم کو فخر تھا، جن کے اخلاق برگزیدہ اور پیشانیاں نورانی تھیں۔

غدا سمراً بین الانام حدیثهم
و ذا سمر یدمی المسامع کالسمر

ان کا ذکر اب دنیا میں ایک افسانہ ہوگیا، اور یہ وہ افسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلودہ کرتا ہے۔

و فی الخبر المروی دین محمد
یعود غریباً مثل مبتدء الامر

حدیث میں آیا ہے کہ دینِ محمدی پھر غریب ہونے والا ہے، جیسا کہ ابتدائے حال میں وہ غریب تھا۔

آ آغرب من ھذا یعود کما بدا
و سبی دارالسلم فی بدء الکفر

کیا وہ اس حالت سے بھی زیادہ غریب ہونے والا ہے کہ تمام دارالاسلام کفر کے آتے ہی غریب ہوگیا ؟

أتذکر فی اعلی المنابر خطبۃٌ
و مستعصم باللہ لم یک فی الذکر

کیا منبروں پر خطبہ پڑھا جائے گا اور مستعصم باللہ کا اس میں ذکر نہ ہوگا ؟

ضفادع حول الماء تلعب فرحۃٌ
أصبر علی ھذا و یونس فی القعر

کیا اس پر صبر ہو سکتا ہے کہ مینڈک پانی کے ادھر آدھر خوشی سے کھیلتے پھریں اور یونس پانی کی تہ میں ہو ؟

تحیۃ مشتاق و الف ترحم
علی الشھداء الطاھرین من الوزر

مشتاق کا سلام اور ہزاروں رحمتیں آن شہیدوں پر جو گناہوں سے پاک تھے ۔

ھنیئاً لھم کاس المنیۃ مترعاً
و ما فیہ عنداللہ من عظم الاجر

موت کا لبالب پیالہ اور جو کچھ کہ اس میں خدا کی طرف سے اجرِ عظیم ہے ، ان کو گوارا ہوجیو !

علیہم سلام اللہ فی کل لیلۃٍ
بمقتل زوراء الی مطلع الفجر

ہمیشہ ان پر شام سے صبح تک زوراء کی قتل گاہ میں خدا کی رحمت نازل رہیو!

و لیت صماخی صم قبل استماعہ
بہتک اساتیر المحارم فی الاسر

کاش ایسا ہوتا کہ قید میں محلوں کے بے پردہ ہونے کی خبر سننے سے پہلے میرے کان بہرے ہو جاتے۔

کان صباح الاسر یوم قیامۃٍ
علیٰ امم شعث تساق الی الحشر

قید کی صبح گویا قیامت کا دن تھا کہ اُمتیں سر میں خاک ڈالے ہوئے میدانِ حشر کی طرف ہنکائی جاتی تھیں۔

و مستصرخ یا للمروۃ فانصرو
و من یصرخ العصفور بین یدی صقر

بہت سی فریاد کرتے تھے کہ دہائی ہے مروت کی، کوئی مدد کرو، مگر باز کے پنجے میں چڑیا کی فریاد کو کون پہنچتا ہے۔

یساقون سوق المعز فی کبد الفلا
عزائز قوم لا یعودون بالزجر

جو لوگ زجر اور دھمکی سننے کے عادی نہ تھے، ان کے حرمِ محترم صحرا میں بکریوں کی طرح ہنکائے جاتے تھے۔

جلبن سبایا سافرات وجوھھا
کواعب لا تبرزن من حلل الخدر

جو لڑکیاں پردے میں چادروں سے چہرے باہر نہ نکالتی تھیں ، ان کو کھلے منہ اسیر کر کے لے گئے -

تقوم و تخفو فی المعاجر واللوی
و ھل یختفی مشی النواعم فی الوعر

وہ کھڑی ہوتی ہیں اور چادروں اور ٹیلوں کی ڈھلانوں میں منہ چھپاتی ہیں ، مگر اُن کٹھن رستوں میں نازنینوں کی چال کب چھپ سکتی ہے -

لقد کان فکری قبل ذالک ما تری
فاحدث امر لا یحیط بہ فکری

اس سے پہلے میری فکر جیسی تھی تُو جانتا ہے ، مگر ایک ایسا امرِ عظیم حادث ہوا جو میرے فکر کے احاطے سے باہر ہے -

و بین یدی صرف الزمان و حکمہ
مغللۃ ایدی القیاصر و الحبر

زمانے کی گردش اور حکومت کے سامنے شہنشاہوں اور داناؤں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں -

نعوذ بعفواللہ من نار فتنۃ
تاجج من قطرالبلاد الی القطر

خدا کی پناہ ہے فتنے کی اُس آگ سے جو دنیا کی ایک جانب سے دوسری جانب تک بھڑکتی چلی گئی -

بدا و تعالیٰ من خراسان قسطل
فعاد رکاماً لا یزول عن البدر

خراسان سے ایک غبار نمودار ہو کر بلند ہوا اور ایک گھنگھور گھٹا بن گئی جو چاند پر سے ہٹنے والی نہ تھی -

رعی اللہ انساناً تیقظ بعدھم
لان مصاب الزید مزجرة العمرو

خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو دولتِ بنی عباس کے بعد خوابِ غفلت سے بیدار ہو گیا ، کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے -

و سائر ملک یقتفیہ زوالہ
سوی ملکوت القائم الصمد الوتر

خدائے بے نیاز و یگانہ کے ملک کے سوا ہر ملک اور سلطنت کے پیچھے اس کا زوال لگا ہوا ہے -

اذا کان بعد الموت لا فرق بیننا
فلا تنظرن الناس بالنظر الشزر

جب کہ مرنے کے بعد ہم سب میں کچھ فرق نہ رہے گا تو لوگوں کو تکبر کی نگاہ سے مت دیکھ -

و جاریة الدنیا نغومة کفھا
محسنة لکنھا الکلب ذوالظفر

کتے کی طرح معشوقۂ دنیا کی ہتیلیاں تو نرم نرم اچھی معلوم

ہوتی ہیں لیکن اس کے ناخن تیز ہیں ۔

و لو ان ذا مال من الموت خالیاً
لکان جدیرا بالتعاظم و الکبر

اگر مال و دولت والا موت سے خالی ہوتا تو البتہ بڑائی اور تکبر کرنے کا مستحق تھا ۔

ربحت الھدیٰ ان کنت عامل صالح
و ان لم تکن والعصر انک لفی خسر

اگر تو نے نیک عمل کیے تو ہدایت کا نفع اٹھا لیا ، ورنہ کچھ شک نہیں کہ تو ٹوٹے میں رہا ۔

علی المرء عار کثرۃ المال بعدہ
و انک یا مغرور تجمع للفخر

مرنے کے بعد بہت سا مال چھوڑ جانا آدمی کے لیے ننگ کی بات ہے ، مگر اے غافل ! تو اُلٹا فخر کے لیے مال جمع کرتا ہے ۔

عفیٰ اللہ عنا ما مضیٰ من جریمۃٍ
و من علینا بالجمیل من الستر

خدا تعالیٰ ہماری گزشتہ خطائیں معاف فرمائے اور ہمارے عیب بالکل چھپا کر ہم پر احسان کرے ۔

خاتمہ

شیخ کے عام حالات اور اُس کی عام شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج ، قوی اور جفا کش آدمی تھا۔ اس کے قویٰ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے دس بارہ حجؔ پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی۔

اس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتّفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہلِ سلوک نفس شکنی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال ادنیٰ درجے کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں ، اس نے بھی بیت المقدّس اور اس کے گرد و نواح میں ایک مدّت تک سقّائی کی تھی۔

اس کا مذہب جیسا کہ خود اس کے کلام سے ظاہر ہے ، تسنُّن معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح اکثر صوفیہ کی نسبت گمان تشیّع کا کیا گیا ہے ، اس کو بھی قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعی لکھا ہے۔ ہم اس کے کسی خاص مذہب کا ثبوت دے کر ایک ایسے شخص کو ، جو مقبولِ فریقین ہے ، ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے تعصّب تھا اور یہی اس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے۔

اس کو اکثر تذکرہ نویسوں نے اہلِ باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے۔ اس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشّح ہوتا ہے کہ وہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی تھا مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلف کھلا ڈُلا یار باش ہنسوڑ ، ظریف ، ریا اور نمائش

سے دور سیدھا سادہ مسلمان تھا ۔ اس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازمِ بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلّف مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا ۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر مشرق کے عام شعرأ کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا ۔ اس نے مثل ظہیر ، رشید ، خاقانی اور انوری وغیرھم کے بادشاہوں کی مداحی اور امیروں کی بھٹئی کرنے کو اپنی وجہِ معاش نہیں بنایا تھا ۔ با این ہمہ وہ امراء اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور ان کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے اس کی کچھ نذر کرتا تھا وہ لے بھی لیتا تھا ۔ اس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا ۔ زیادہ تر اس کے قصیدے ایسے ہیں جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے ۔ امیروں سے وہ اس لیے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اس کی سفارش سے ، جیسا کہ گلستاں کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے ، غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے ۔

خودداری اور غیرت اس میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا ، جیسا کہ اسکندریہ کے قحط میں اس سے ظہور میں آیا ۔ خلقت کی خیرخواہی اور ہمدردی خدا تعالیٰ نے اس کی سرشت میں ودیعت کی تھی ۔ اس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے اگر انسانی ہمدردی کا جوش اس کے دل میں نہ ہوتا ۔ اس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا ۔

کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا جب تک دو

باتیں جمع نہ ہوں ؛ ایک جوہرِ فطری ، دوسرے زمانے کے ایسے اتفاقات جو اس کے جِلا کے باعث ہوں - شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اسی کے موافق اس کو اتفاقات پیش آئے تھے - جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا ، جہاں ہونہار بچوں کو خود بخود کسبِ کمال کی ترغیب ہونی چاہیے ، یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بے کسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رُشد کا باعث ہوئی ہیں - جس مدرسے میں وہ حسنِ اتفاق سے تحصیلِ علم کے لیے پہنچا ، وہ تمام مدارسِ اسلامیہ میں ممتاز اور سربرآوردہ تھا ، اور جس دارالخلافہ میں وہ مدرسہ واقع تھا ، وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مہذب تھی -

اس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ نہیں کیا تھا بلکہ زمانے نے بھی اس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی - اس کی عمر کا ایک بہت بڑا اور مفید حصہ نہایت کٹھن اور دور و دراز سفر کرنے اور دنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا - سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات ، ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دل‌سوزی اور ہمدردی اس کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی - بیسیوں خاندان اس کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے - ایک بار ، جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے ، شام میں اس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور روستائی زادے وزارت کے درجے کو پہنچ گئے - ساتویں صدی میں ، جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اس نے اکیانوے برس بسر کیے تھے ، عجیب و غریب تماشے اس کی

نظر سے گزر گئے ۔ سلاطینِ کردیہ کا خاندان ، جن کی سطوت و جلالت ایشیا ، افریقہ اور یوروپ میں یکساں مانی جاتی تھی ، اسی صدی میں تمام ہوا ۔ سلاجقہ ، قونیہ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی ، جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کر دیا ، اسی صدی میں ہوئی ۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت ، جو بحیرۂ خزر اور جھیل یورال سے دریائے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی ، اسی صدی میں تاتاریوں[1] کے ہاتھ سے برباد ہوئی ۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانچ سو برس بعد اسی صدی میں ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہوئی اور بقول بعض مؤرخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہہ گیا ۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستاں اور بوستان میں ہے ، اور مصر کا قحط جس میں حسبِ تصریحِ صاحبِ 'وصاف' ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا ، اسی صدی میں واقع ہوئی ۔ اتابکانِ فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا ۔ دارالملک شیراز ، جو شیخ کا مولد و مسکن تھا ، اسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا ۔ فرقۂ اسمٰعیلیہ ، جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور شور کے ساتھ حکمران رہا ، ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کردوں نے شام میں ہمیشہ کے لیے اسی صدی میں کیا ۔

---

۱ ۔ اس معرکے میں ، جیسا کہ شیخ نجم‌الدین دایہ نے 'مرصادالعباد' کے دیباچے میں لکھا ہے ، تاتاریوں نے صرف رے اور اس کے نواح میں تقریباً سات لاکھ مسلمان قتل اور اسیر کیے تھے اور خراسان کے چار شہر : بلخ ، مرو ، ہرات اور نیشاپور بالکل تاراج اور نابود ہوگئے اور ان کے دائیں بائیں اکثر بستیاں قتل و غارت کا نشانہ ہوئیں ۔

یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے، جن سے ایک صاحبِ بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے - چنانچہ بغداد کا مرثیہ ، جو اس نے عربی میں لکھا ہے ، اس میں کہتا ہے :

''رعی اللہ انساناً تیقظ بعدھم
لان مصاب الزید مزجرۃ العمرو''

یعنی خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے - یوروپ کے مشہور مصنف ہگ ملر صاحب کا قول ہے کہ ''میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک سکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے ، جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دل سوز استاد تھے -''

اس کے سوا جیسی عمدہ صحبتیں شیخ کو میسر آئی تھیں ، ویسی بہت کم آدمیوں کو میسر آتی ہیں - شیخ کی عادت ، جیسا کہ ایک رسالے[1] میں اس کے فحوائے بیان سے معلوم ہوتا ہے ، یہ تھی کہ عالمِ سفر میں وہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علما ، صلحا ، مشائخ اور کاملین سے ضرور ملتا تھا - صاحبِ 'نفحات الانس' نے لکھا ہے کہ شیخ نے کثرت سے دانش مندوں اور عالموں کو دیکھا تھا - وہ خود بھی بوستان میں کہتا ہے :

تمتّع ز ہر گوشۂ یافتم
ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

اگرچہ ساتویں صدی ہجری میں ، جس میں کہ شیخ کی جوانی اور

---

۱ - یہ رسالہ شیخ کی کلیات میں شامل ہے -

بڑھاپا گزرا تھا ، مسلمانوں کی علمی ترقیات اور فضائل و کمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہوگئے تھے لیکن پھر بھی بلادِ اسلام میں ایک جمِّ غفیر اعلیٰ درجے کے مشائخ اور علما و حکما کا نظر آتا تھا۔ خصوصاً جن ملکوں میں شیخ کی زیادہ آمد و رفت رہی ہے ، جیسے ایران ، روم ، شام ، عراق ، عرب اور مصر وغیرہ ۔ وہ اب بھی دینی اور دنیوی علوم کے مرکز تھے - ہمارے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات پائی ہے اور جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا ، ان میں کم سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقّق ایسے موجود تھے جو تمام بلادِ اسلام میں مانے گئے ہیں اور جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں - جیسے شیخ محی الدّین ابن العربی ، خواجہ نصیرالدین طوسی ، شیخ صدر الدّین قونوی ، مولانا جلال الدّین رومی ، ابنِ تیمیّہ حرّانی ، امام یافعی ، شیخ ابوالحسن شاذلی ، شیخ تاج الدّین قسطلانی ، شیخ شہاب الدّین سہروردی ، شیخ ابنِ فارض ، شیخ اوحد الدّین کرمانی ، قاضی ابنِ خلکان ، شیخ الاسلام تقی الدین ابن الصلاح ، خواجہ علاء الدولہ سمنانی ، خواجہ بہاء الدین نقشبند ، علامہ قطب الدین شیرازی ، امام محی الدین نووی ، قاضی ناصر الدین بیضاوی ، ابنِ عساکر ، فقیہ شافعی وغیرہ وغیرہ - ایسے ایسے سیکڑوں جلیل القدر علماء اور مشائخ شیخ کی نظر سے گزرے تھے ، اور ان کے علاوہ جیسا کہ گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتا ہے ، وہ ہر فرقے اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور ان کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتا تھا - جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا ، اسی طرح امراء کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتا تھا - کبھی وہ ابرار اور احرار کی صحبت

سے مستفیض ہوتا تھا اور کبھی اوباش و الواط کے جلسوں کا تماشائی تھا - نہ اس کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا ، نہ بت خانے میں رہنے سے ننگ تھا - اسی نے جامع بعلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا اور وہی بت خانۂ سومنات میں ایک مدت تک پجاری رہا - کبھی وہ بصرے کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا - غرضیکہ اس کی تمام عمر خصائلِ انسانی اور نیرنگیِ روزگار کے مطالعے میں بسر ہوئی تھی - اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اس کو گریٹ مورلسٹ کہا ہے اور اسی وجہ سے اخلاقِ بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ، ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھچ سکی - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعراے ایران میں جس قدر عمر شیخ نے پائی ہے، ظاہرا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی - جہاں تک ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے ، اس نے ۱۲۰ برس اس قفسِ عنصری میں بسر کیے ہیں - اگرچہ ہر علم و فن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ عمر پانی ضرور ہے مگر شاعر کے لیے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے - شاعر جس قدر بڈھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے - اگرچہ شیخوخت کے مرتبے کو پہنچ کر شاعر کے فکر میں بلند پروازی نہیں رہتی لیکن بلاغت ، جو شاعری کا رکنِ اعظم ہے ، کمال کو پہنچتی جاتی ہے - یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے ، گو کہ ان کی قابلیت و استعداد اعلیٰ درجے کی تھی ، مگر ان کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا - جیسا کہ عُرفی شیرازی کی نسبت شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ''غنچۂ استعدادش ناشگفتہ ماند -'' ایک نوجوان شاعر ، جس کی طبیعت میں کمال جودت اور بلند پروازی ہو ، بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شوخ ، چالاک اور الّھڑ

بچھیرا جس کی بھاگ دوڑ اور جست و خیز اکثر بے اصول اور خلافِ قاعدہ ہوتی ہے اور ایک معمّر، سن رسیدہ شاعر، گو اس کی فکر کیسی ہی پست اور محدود ہو، اس شائستہ اور سُدھ منے گھوڑے کے مانند ہے جو کبھی بے اصول قدم نہیں اٹھاتا ۔ الغرض شاعری کے لیے جتنی ضروری شرائط درکار ہیں وہ سب خدا تعالیٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں ۔

شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے ؛ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقتِ واقعیّہ پر، نہ کہ محض اختراعِ ذہن پر مبنی ہونے چاہییں، ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی ۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالا پن اور تعجّب پایا جائے، ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا ۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کیے جائیں، کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرۂ شاعری سے خارج ہوگا ۔ چوتھے شاعر کے دل میں، جب کہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے، کم و بیش اس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہیے، ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا ۔ یہ چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پوری پائی جاتی ہیں، ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیں گی ۔ اگرچہ بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیتیں موجود ہیں لیکن ان کا کلام چونکہ نہایت محدود اور ایک خاص صنف میں منحصر ہے، جیسے خواجہ حافظ شیراز کی غزل، اس لیے ہم ان کو شیخ کا ہم پلّہ نہیں سمجھتے ۔ شیخ کو اور شعرأ پر اس سبب سے بھی بہت بڑی فوقیت ہے کہ اس کی نظم و نثر دونوں مسلّم الثّبوت ہیں ۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلّم الثبوت شعرأ گزرے

ہیں ان میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے تسلیم کیا ہو ۔ اگرچہ ہندوستان میں نورالدین ظہوری کو بھی نثر و نظم کا جامع مانتے ہیں لیکن اہلِ ایران اس کی نظم و نثر دونوں کو ناپسند کرتے ہیں ۔ بے شک اس کی 'سہ نثر' کے اکثر فقرے بادی النّظر میں نہایت دلفریب ہیں ، جیسے :

''سنبلِ حرفش از آہِ ناشکیباں ، بنفشۂ نقطہ اش از خالِ دلفریباں ، از رشحِ طراوتِ کلمات ، نہرِ سطر مالا مالِ آبِ حیات ، خضر تشنہ لب سیرابی ادا ، مسیحا مردۂ جان بخشیِ ہوا ، نکتہ ہائے برجستہ ، غنچہ ہائے سربستہ ، نثرش نژۂ رفعت ، شعرش شعریٰ مرتبت ، ہر صفحہ چمنے و ہر سطرے نخلے ، برگش لفظ دلکش و بارش معنیِ بے غش ، ہر حرفش فصلے و ہر فرعش اصلے ۔''

اسی طرح 'سہ نثر' کے اور بہت سے فقرے الفاظ پرستوں کو نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں الفاظ کے سوا اور کچھ بھی نہیں :

خوب اند و خوش اند و 'بو' ندارند

بخلاف اس کے شیخ نے گلستاں میں اس سے بہت زیادہ دلآویز و دلکش الفاظ میں حقائقِ واقعیہ کو بیان کیا ہے ۔ یہ بات گلستاں کے سوا کسی فارسی نثر میں آج تک نہیں دیکھی گئی ، مثلاً :

۱ ۔ در ایّامِ جوانی چنانکہ افتد و دانی ، نظرے داشتم بہ روے و گزرے داشتم بہ کوے ۔

۲ ۔ اے برادر حرم در پیش ست و حرامیاں از پس ، اگر رفتی

بُردی و اگر خفتی مردی -

۳ - آزردنِ دلِ دوستاں جہل ست و کفارۂ یمین سہل -

۴ - توکہ چراغ نہ بینی بہ چراغ چہ بینی -

۵ - طریقِ درویشاں ذکر ست و شکر و خدمت و طاعت و ایثار و قناعت و توحید و توکل و تسلیم و تحمّل - ہر کہ بدیں صفتہا موصوف ست ، بحقیقت درویش ست ، اگرچہ در قباست - امّا ہرزہ گردے ، بے نمازے ، ہوا پرستے ، ہوس بازے کہ روزہا بشب آرد در بند شہوت و شبہا روز کند در خوابِ غفلت ، و بخورد ہرچہ درمیاں آید و بگوید ہرچہ بر زباں آید ، زندیق ست اگرچہ در عباست -

۶ - پدر را عسل بسیارست ، اما پسر گرمی دارست -

۷ - صیاد بے روزی در دجلہ ماہی نگیرد و ماہی بے اجل بر خشکی نمیرد -

۸ - گوئی خوردہ مینا بر خاکش ریختہ و عقدِ ثریا از تاکش در آویختہ -

۹ - عصارۂ تاکی بقدرتش شہدِ فائق شدہ و تخمِ خرما بہ یمنِ تربیتش نخلِ باسق گشتہ -

نظم و نثر کے جامع فارسی زبان ہی میں نادر الوجود نہیں ہیں بلکہ ہر زبان میں یہی حال ہے - انگریزی میں باوجودیکہ لٹریچر کی ترقی انتہا کے درجے کو پہنچ گئی ہے ، صرف گنتی کے آدمی ایسے

ہیں جن کو نظم اور نثر دونوں میں تمام اہلِ فن کے نزدیک قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ بعضے ملٹن کو اور بعضے سکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدھ آدمی کو نظم و نثر کا جامع خیال کرتے ہیں۔ پس شیخ کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ ایران میں صرف اسی کی نظم و نثر دونوں ایسی ہیں جن کو تمام اہلِ زبان نے تسلیم کیا ہے۔

شیخ نے بھی تغزّل یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعرائے ایران کی طرح امردوں اور سادہ رُخوں کے عشق ہی پر رکھی ہے۔ لیکن یہ بات جیسی کہ بادی النّظر میں مذموم اور قبیح معلوم ہوتی ہے، حقیقت میں ایسی نہیں ہے، اور صرف اس بنا پر شیخ یا ایران کے اور شعراء پر امرد پرستی کا الزام لگانا بے جا ہے۔ فارسی زبان میں اور اس کی پیروی سے اردو زبان میں بھی ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت، رند ہو یا صوفی، خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا، مرد کا عاشق ہو یا عورت کا، بلکہ سرے سے عاشق ہو یا نہ ہو، ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اس کا معشوق دونوں مرد ہیں۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت، دنیا دار ہو یا تارک الدّنیا، عشقِ حقیقی رکھتا ہو یا عشقِ مجازی، مرد کا عاشق ہو یا عورت کا، ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے ثابت ہو کہ شاعر عورت ہے اوراس کا معشوق مرد ہے۔ اسی طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد اور کہیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑے گا۔

حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی غزلوں سے صاف یہ پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ رخ لڑکے پر مفتون ہیں اور ان کے ہندی دوہروں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے اور عربی قصائد کی تشبیبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطر و بے قرار ہے - اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوانِ بیان ہیں جن کو حقیقتِ واقعی سے کچھ علاقہ نہیں ہے - جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر ، جنھوں نے نہ کبھی شراب کا مزا چکھا ، نہ اس کی صورت دیکھی ، نہ اس کی بُو سونگھی ، صدہا شعر شراب و کباب کے مضمون کے لکھتے ہیں ، اسی طرح ہزاروں پاک باز اور صاحبِ عفّت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں - البتّہ اس سے مشرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے ، جس کے اصول اور فروع سب تصنّع اور بناوٹ اور ادعاے محض پر مبنی ہیں ، لیکن شیخ سعدی اور مولانا روم اور امیر خسرو اور خواجہ حافظ اور تمام شعراے متصوّفین اس سے مستثنیٰ ہیں ، کیونکہ یہ لوگ اکثر عشقِ مجازی کے پیرایے میں اپنے واردات اور حالات اور حقائقِ واقعیہ بیان کرتے ہیں - بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے کلام کو ، جس میں بظاہر تمام خال و خط اور شراب و شاہد کے مضامین درج ہیں ، حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اس سے شاہدِ حقیقی کی شیون و صفات مراد لینی صرف ایک ملّایانہ گھڑت ہے ، جس سے سراسر تکلّف اور بناوٹ پائی جاتی ہے - مگر ایسا خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کوچۂ شاعری سے نابلد ہیں - کنایہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور دوست کا ذکر ہمیشہ اغیار سے چھپایا جاتا ہے - چنانچہ مولانا روم مثنوی میں

صاف صاف فرماتے ہیں :

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

شعرائے متصوّفین کے اشعار اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کیے جائیں تو ان میں وہ کرشمہ ، جس نے ایک عالم کے دل کو تسخیر کیا ہے ، باقی نہیں رہتا ۔ 'نفحات الانس' میں لکھا ہے کہ "مولانا محمد شیریں ، جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوانِ غزلیات متصوّفانہ اشعار میں مشہور ہے ، اُن کے سامنے کسی نے ان کے معاصر شیخ کمال اسمٰعیل خجندی کا یہ مطلع پڑھا :

چشم اگر این ست و ابرو این و ناز و عشوہ ایں
الوداع اے زہد و تقویٰ ، الفراق اے عقل و دیں

مولانا نے سن کر کہا ایسا شعر کہنا کیا ضرور ہے جو معنیِ مجازی کے سوا کوئی اور محل نہ رکھتا ہو ۔ شیخ نے بھی یہ بات سنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھیڑ کر کہا کہ چشم اور عین مترادف لفظ ہیں ، پس عین سے ذاتِ الٰہی مراد لی جا سکتی ہے اور ابرو حاجب کا مرادف ہے ۔ پس ممکن ہے کہ حاجب سے صفاتِ الٰہی، جو کہ حاجبِ ذات ہیں ، مراد لی جائیں ۔ مولانا نے اس توجیہ کو تسلیم کیا اور شیخ کے بیان کی داد دی ۔" خواجہ حافظ کی نسبت اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "یہ شخص لسان الغیب اور ترجمان الاسرار تھا ، اس نے اکثر اسرارِ غیبی اور معانیِ حقیقی ، مجاز کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کیے ہیں کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہو سکا ۔" پھر اکابر صوفیہ میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو کہ صوفیہ کے حق میں دیوانِ حافظ کو تمام دیوانوں

سے بہتر بتاتے تھے ، لیکن حق یہ ہے کہ تغزّل کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی کے تتّبع سے حاصل کیا ہے -

البتّہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ انہوں نے تغزّل کی بنیاد امرد پرستی پر کیوں رکھی ہے ؛ عرب کی شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت ، اور ہندی میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہیں ، اور یہ دونوں طریقے نیچر کے مطابق ہیں ، مگر مرد کا مرد پر عاشق و فریفتہ ہونا اور اس سے وصل کا طالب اور کام جو ہونا اگرچہ محض زبانی جمع خرچ کیوں نہ ہو ، ایک ایسا طریقہ ہے جس سے فطرتِ انسانی بالکلِ ابا کرتی ہے - ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کا تفرقہ نہیں ہے - اس میں ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی ہیں - پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعراء اپنے تئیں عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں ، لیکن اس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضمائر یا افعال وغیرہ سے یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت ، رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ فارسی میں عاشق اور معشوق دونوں مرد فرض کیے جاتے ہیں - میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی توجیہ ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ تھوڑا ہی سا شبہہ باقی رہ جاتا ہے - اس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ جب مسلمان عرب سے نکل کر اطراف و جوانب میں پھیلے تو بسبب اس کے کہ ان کے ہاں عورتوں کا مردوں سے چھپانا مذہبی فرائض میں سے تھا ، غیر قوموں کے میل جول سے عورتوں کے باب میں ان کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی -

خصوصاً مسلمان بادشاہوں میں اس غیرت کا ظہور سب طبقوں سے زیادہ تھا ۔ ڈاکٹر برنیر فرانسیسی ، جو ہندوستان میں پندرہ سولہ برس عالم گیر کے ساتھ رہا ہے ، اپنے وقائعِ سفر میں لکھتا ہے :
''ہندوستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو بیگمات کی سواری کے نزدیک کوئی متنفّس ، اگرچہ کیسا ہی ذی مرتبہ اور صاحبِ اعتبار ہو، نہیں جانے پاتا تھا ، ورنہ بالضّرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ہاتھ سے نہایت بے رحمی کے ساتھ پٹتا تھا ۔ اور ایران میں سنا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیگماتِ کی سواری سے آدھے فرسنگ کے فاصلے پر نظر پڑ جاتا تھا تو اُس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی ، اور جس شہر یا گاؤں میں سے بیگمات کی سواری نکلتی تھی وہاں کے تمام مرد اور عورت اپنے اپنے مقام اور مسکن چھوڑ کر چلے جاتے تھے ۔'' شاید اس بیان میں کچھ مبالغہ ہو ، مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاہوں کی غیرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی ۔ چوں کہ شعرا اکثر بادشاہوں کے مدّاح اور مصاحب ہوتے تھے اس لیے وہ کوئی بات سلاطین کے مقتضائے مزاج کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے ۔ پس نہایت قوی گمان ہے کہ شعراء نے غزل اور تشبیب میں عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر کرنا اور جو جو معاملات عشق کے زمانے میں عاشق اور معشوق کے درمیان واقع ہوتے ہیں ، ان کو صاف صاف بیان کرنا سلاطین کی غیرت اور حمیّت کے برخلاف سمجھا ہو اور اس لیے تمام عشقیہ مضامین امردوں اور سادہ رخوں پر ڈھالے گئے ہوں ۔ سلاطینِ مغلیہ میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گزرا ہے وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے ؛ ایک موقع پر جہانگیر کے روبرو قوّال امیر خسرو کی غزل گا رہا تھا اور بادشاہ اس کو سن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا ۔ جب قوّال نے یہ شعر گایا :

تو شبانہ مے نمائی بہ برِ کہ بُودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ دفعةً بگڑ گیا اور قوّال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا ، اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خوّاص خوف سے لرزنے لگے، اور فوراً مـلّا نقشی مُہر کن کو، جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا ، بلا کر لائے تا کہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیما کریں - جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا - عرض کیا : ''حضور ! خیر باشد -'' بادشاہ نے کہا : ''دیکھو ، امیر خسرو نے کیسی بے عزتی کا مضمون شعر میں باندھا ہے ، بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے عزتی کی بات کہہ سکتا ہے ؟''

ملّا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اسی وقت بادشاہ کا غصہ فرو کر دیا - انھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشو و نما پایا تھا اس لیے وہ اکثر ہندوستان کے اصول کے موافق شعر کہتے تھے - یہ شعر بھی انھوں نے اسی طریقے پر کہا ہے - گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشے کا یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے - یہ سن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بجانا ہونے لگا -

اگرچہ شیخ یا اور شعرائے ایران کے عاشقانہ اشعار سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ان کی امرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہو سکتا ، لیکن اس میں شک نہیں کہ گلستان کے پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبت اس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ

کسی وقت میں سادہ رخوں اور امردوں کی طرف اس کو میلانِ خاطر رہا ہے ، مگر اس بات کو میں کسی برے معنی پر محمول نہیں کرتا ۔ صوفیہ کے حالات ؛ جو 'نفحات' وغیرہ میں لکھے ہیں ، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عشقِ مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو ، سالک کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقیِ باطنی کا ہے اور اکثر بڑے بڑے مشائخ اور عرفا میں یہ خصلت پاک دامنی اور عفّت کے ساتھ دیکھی گئی ہے ۔ شیخ نے جس طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا جا بجا اقرار کیا ہے اسی طرح ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس سے بیسیوں جگہ اپنی براءت بھی کی ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ غزل میں کہتا ہے :

گر نظرِ صدق را نامِ گنہ می نہند
حاصلِ ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

(پہلے ایڈیشن کے سرورق کے آخری صفحے پر
مولانا حالی کے اعلان کی پوری نقل)

اعلان

اس کتاب کی رجسٹری حسبِ ضابطہ ہو گئی ہے
مصنف کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے

اشتہار : مفصلۂ ذیل کتابیں راقم کے پاس موجود ہیں - جو صاحب کوئی کتاب منگانی چاہیں قیمتِ مندرجہ ذیل بذریعۂ منی آرڈر یا پوسٹل نوٹ راقم کے پاس بھیج کر طلب فرمائیں - اگر کوئی صاحب دس روپے یا اس سے زیادہ کی کتابیں فروخت کے لیے خریدیں گے، اُن کو مناسب کمیشن پر دی جا سکتی ہیں -

(۱) ''مسدس مد و جزرِ اسلام'' جس میں ضمیمۂ مسدس اور فرہنگ شامل ہے - } کاغذ قسم اول : بارہ آنے، قسم دوم : آٹھ آنے

(۲) ''حیاتِ سعدی'' جس میں شیخ کی سوانح عمری اور اُس کی تصنیفات پر ریویو بہت شرح و بسط سے لکھا گیا ہے - } سوا روپیہ

(۳) ''سفر نامۂ حکیم ناصر خسرو مع سوانح عمری حکیم''، مرتبۂ راقم، بہ زبان فارسی - } کاغذ قسم اول : یک روپیہ، قسم دوم : بارہ آنے

(۴) مثنوی مناجاتِ بیوہ — ڈھائی آنے

المشتہر

خاکسار الطاف حسین حالی، مقیم دہلی، کوچۂ پنڈت -

مجلس ترقی ادب لاہور